اشاعت کا ۹۵ واں سال
زبان وادب، تہذیب وثقافت کا ترجمان

نیا دور

مارچ ۲۰۱۸ء
۱۰ روپئے

اسلم جمشید پوری
طلعت گل
ثوبان سعید
نور فاطمہ
صالحہ صدیقی
سید محمد عقیل
سفینہ بیگم

محکمہ اطلاعات ورابطۂ عامہ، اترپردیش

اردو کے مایۂ ناز ادیبوں اور شاعروں کی تاریخ پیدائش (مارچ)

اصغر گونڈوی

رام لعل

میکش اکبرآبادی

سید ضمیر حسن دہلوی

شفیق جونپوری

مظہر امام

قیوم نظر

ساحر لدھیانوی

مہندر سنگھ بیدی سحر

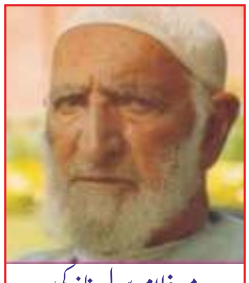
میر غلام رسول نازکی

علی جواد زیدی

عبدالماجد دریابادی

واجدہ تبسم

شوکت صدیقی

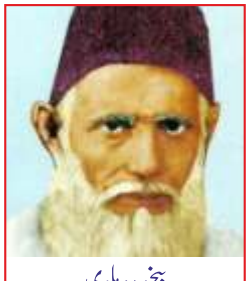
بیخود دہلوی

اصغر گونڈوی	یکم مارچ ۱۸۸۴	۳؍نومبر ۱۹۳۶
اجمل اجملی	یکم مارچ ۱۹۳۲	اگست ۱۹۹۳
عبداللطیف اعظمی	یکم مارچ ۱۹۱۷	مئی ۲۰۰۲
رام لعل	۳؍مارچ ۱۹۲۳	۵؍اکتوبر ۱۹۹۶
دھرم پال گپتا وفا	۳؍مارچ ۱۹۰۷	۱۵؍نومبر ۱۹۸۵
میکش اکبرآبادی	۳؍مارچ ۱۹۰۲	۲۵؍اپریل ۱۹۹۱
سید ضمیر حسن دہلوی	۴؍مارچ ۱۹۴۰	۱۷؍مئی ۲۰۱۴
شفیق جونپوری	۵؍مارچ ۱۹۰۲	۵؍مارچ ۱۹۶۲
مظہر امام	۵؍مارچ ۱۹۳۰	۳؍جنوری ۲۰۱۲
بخش لائل پوری	۵؍مارچ ۱۹۳۴	مارچ ۲۰۰۲

آغا شاعر قزلباش	۵؍مارچ ۱۸۷۱	یکم مارچ ۱۹۴۰
قیوم نظر	۷؍مارچ ۱۹۱۴	۱۹۸۹
ساحر لدھیانوی	۸؍مارچ ۱۹۲۱	۲۵؍اکتوبر ۱۹۸۰
مہندر سنگھ بیدی سحر	۹؍مارچ ۱۹۰۹	۱۷؍جولائی ۱۹۹۲
میر غلام رسول نازکی	۹؍مارچ ۱۹۱۰	۱۶؍اپریل ۱۹۹۸
ہنس راج رہبر	۹؍مارچ ۱۹۱۳	۲۳؍جولائی ۱۹۹۴
علی جواد زیدی	۱۰؍مارچ ۱۹۱۶	۶؍دسمبر ۲۰۰۶
مائل خیرآبادی	۱۰؍مارچ ۱۹۱۰	۱۸؍دسمبر ۱۹۹۸
ساجد رشید	۱۱؍مارچ ۱۹۵۵	۱۱؍جولائی ۲۰۱۱
عبدالماجد دریابادی	۱۵؍مارچ ۱۸۹۲	۷؍جنوری ۱۹۷۷

نصیرالدین ہاشمی	۱۵؍مارچ ۱۸۹۵	۲۶؍ستمبر ۱۹۶۵
جلیل قدوائی	۱۵؍مارچ ۱۹۰۴	۲۲؍فروری ۱۹۷۱
واجدہ تبسم	۱۶؍مارچ ۱۹۳۵	۷؍دسمبر ۲۰۱۱
امجد حیدرآبادی	۱۹؍مارچ ۱۸۸۸	۲۹؍مارچ ۱۹۶۱
شوکت صدیقی	۲۰؍مارچ ۱۹۲۳	۱۸؍دسمبر ۲۰۰۶
بیخود دہلوی	۲۱؍مارچ ۱۸۶۳	۲؍اکتوبر ۱۹۵۵
دیانرائن نگم	۲۲؍مارچ ۱۸۸۲	۲؍نومبر ۱۹۴۲
دوا کر راہی	۲۷؍مارچ ۱۹۱۴	۳؍جنوری ۲۰۰۲
میاں بشیر احمد	۲۹؍مارچ ۱۸۹۳	۳؍مارچ ۱۹۷۱

بشکریہ 'قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان'

جلد : ۷۲ شمارہ : ۱۱

ماہنامہ نیا دور لکھنؤ

مارچ ۲۰۱۸ء

پبلشر: انج کمار جھا

ڈائرکٹر محکمہ اطلاعات ورابطہ عامہ، اتر پردیش

ایڈیٹر

سہیل وحید

فون: 9415007694

Ph. No. 2239132 Ext. 228

Email: nayadaurmonthly@gmail.com

معاون

شاہد کمال

رابطہ برائے سرکولیشن وزرِ سالانہ

صبا عرفی

فون: 7705800953

تزئین کار : وقار حسین

سرورق: ایس آر جائسوال

مطبوعہ: پرکاش پیکیجرس، گولہ گنج لکھنؤ

شائع کردہ: محکمۂ اطلاعات ورابطۂ عامہ، اتر پردیش

زرِ سالانہ : ۱۱۰ روپے

ترسیل زر کا پتہ

ڈائرکٹر

انفارمیشن اینڈ پبلک ریلیشنز ڈپارٹمنٹ

پارک روڈ، اتر پردیش، لکھنؤ 226001

Please send Cheque/Bank Draft in favour of Directer, Information & Public Relations Department, UP, Lucknow

خط وکتابت کا پتہ

ایڈیٹر نیا دور، پوسٹ باکس نمبر ۱۴۶ لکھنؤ ۲۲۶۰۰۱

بذریعہ کوریئر یا رجسٹرڈ پوسٹ

ایڈیٹر نیا دور، انفارمیشن اینڈ پبلک ریلیشنز ڈپارٹمنٹ

۶ پارک روڈ، سوچنا بھون، اتر پردیش، لکھنؤ 226001

اس شمارے میں...

دودھ ناتھ سنگھ

اما ئیں

صفحہ ۲۵

مرزا جعفر حسین

مغربی تہذیب ایشیائی معاشرت پر غالب آگئی

صفحہ ۴۵

اسٹیفن لیکاک

مروت

صفحہ ۵۲

حمید دلوائی

ایندھن

صفحہ ۵۴

اسلم جمشید پوری

اردو زبان کے ادبی امکان کی بازیافت

صفحہ ۲۳

طلعت گل

اردو میں رپورتاژ کا فن اور تاریخی روایت

صفحہ ۳۱

نجیب انصاری

ایک سال نئی مثال

صفحہ ۶۰

نور فاطمہ

اردو ادب کا نیا زاویۂ انفراد

صفحہ ۱۹

ثوبان سعید

اردو زبان کا ایک نومولود ارتقائی مرکز

صفحہ ۲۶

محبوب حسن

اک تیر میرے سینے میں مارا کہ ہائے ہائے

صفحہ ۵۷

صالحہ صدیقی

عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَالَمْ یَعْلَمْ

صفحہ ۳

سید محمد عقیل

علم وآگہی، تجربات اور روایات کا حسین امتزاج

صفحہ ۱۰

سفینہ بیگم

یہ میرا چمن ہے میرا چمن میں اپنے چمن کا بلبل ہوں

صفحہ ۱۵

نیا دور میں شائع ہونے والے تمام تر مشمولات میں جن خیالات کا اظہار کیا جاتا ہے، اس کی پوری ذمہ داری مصنف کی ہے۔ حکومت اتر پردیش کا متفق ہونا بہر حال ضروری نہیں ہے۔

اپنی بات

'نیادور' کے فروری ۲۰۱۸ء کی بے پناہ مقبولیت اور پذیرائی کے لئے ادارہ 'نیادور' اپنے تمام قارئین اور چاہنے والوں کا ممنون ہے۔ ہمارے حوصلے کو ایک نئی پرواز ملی۔ اسی کڑی میں ہم مارچ کا یہ شمارہ 'رپورتاژ' کے نام معنون کر رہے ہیں۔ 'رپورتاژ' دراصل فرنچ لفظ ہے جو ماضی قریب ہی میں اردو میں مستعمل ہوا ہے۔ ابھی بھی اردو میں دوسری اصناف کے مقابلے 'رپورتاژ' وافر مقدار میں نہیں لکھے جارہے ہیں۔ جو لکھے جارہے ہیں، ان میں کہانی پن زیادہ ہے اور اکثر سفرناموں کی شکل میں 'رپورتاژ' سامنے آتے رہے ہیں۔ قرۃ العین حیدر کے 'کوہ دماوند' سے لے کر ممتاز مفتی کے 'لبیک' اور دیگر تمام ادیبوں نے 'رپورتاژ' رقم کئے۔ اس کے باوجود اردو میں 'رپورتاژ' لکھنے کی روایت عام نہ ہوسکی۔ ترقی پسند تحریک کے زیر اثر 'رپورتاژ' میں بھی نکھار آیا۔ اس انقلابی اور اشتراکی دور میں افسانہ، غزل، نظم اور ناول میں جو بات نہیں بن پائی اسے ترقی پسند ادیبوں نے 'رپورتاژ' میں لکھنے کی کوشش کی۔ انکی یہ ضرورت اردو ادب کی اس اہم صنف کے لئے باعث تحریک ثابت ہوئی اور اردو ادب کو کئی خوبصورت 'رپورتاژ' نصیب ہوئے۔

ہم نے جامعہ ملیہ اسلامیہ، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، مولانا مظہرالحق عربی و فارسی یونیورسٹی اور خواجہ معین الدین چشتی اردو عربی فارسی یونیورسٹی میں اردو تہذیب وثقافت کی روایت پر 'رپورتاژ' شائع کرنے کا فیصلہ اس لئے کیا تاکہ ان تعلیمی اداروں میں اردو کی تہذیب وثقافت کس حد تک قائم رہ گئی ہے، اس کا اندازہ قارئین کو ہوسکے۔ ہمیں بیحد مسرت ہوئی جب ان سبھی یونیورسٹیوں سے جو 'رپورتاژ' آئے، ان سب نے یہ ثابت کیا کہ ان اداروں نے اردو کے تہذیب وتمدن کو بڑی خوبصورتی سے ہنوز برقرار رکھا ہے۔

مسئلہ یہ تھا کہ ان اداروں سے 'رپورتاژ' کیسے لکھوائے جائیں۔ پروفیسر حضرات کی وفاداریوں اور مجبوریوں کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے ہم نے ان اداروں کے ریسرچ اسکالرس سے رجوع کیا۔ ہمیں یہ بتاتے ہوئے خوشی ہورہی ہے کہ جامعہ ملیہ اسلامیہ اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے ریسرچ اسکالرس نے ہماری ایماء پر بہت عمدہ 'رپورتاژ' تحریر کئے۔ یہ 'رپورتاژ' اس لئے بھی اہم ہیں کہ اس کے لکھنے والے سبھی ریسرچ اسکالرس کی یہ پہلی کاوش ہے۔ اس کا یہ مطلب قطعی نہیں ہے کہ مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، مظہرالحق عربی و فارسی یونیورسٹی اور خواجہ معین الدین چشتی اردو عربی فارسی یونیورسٹی کے اساتذہ نے جو 'رپورتاژ' لکھے وہ کسی بھی معاملے میں ان سے کمتر ہیں۔ ہم نے کوشش کی ہے کہ دانستہ طور پر کسی کی دل آزاری نہ ہو۔ ان 'رپورتاژ' میں کوشش کے باوجود ہمیں پھونک پھونک قدم رکھنے پڑے۔ ان سبھی 'رپورتاژ' کو ایڈٹ کرنے میں ہم نے خاصہ محتاط رویہ اپنایا ہے لیکن پھر بھی ممکن ہے کہ کوئی غلطی راہ پا گئی ہو، اس کے لئے ہم قارئین سے انصراف کی امید کرتے ہیں۔

نیادور فیس بک اور واٹس اپ پر بھی

نیا دور کے شمارے مئی تا حال فیس بک اور واٹس اپ پر قارئین کے مطالعہ لئے پوسٹ کر دئے گئے ہیں اور آئندہ بھی یہ سلسلہ جاری رہے گا۔

ہندوستان میں ہزاروں ایسے تعلیمی ادارے ہیں جن کی داغ بیل میں اردو تہذیب شامل رہی ہے۔ کشمیر واحد ہندوستانی ریاست ہے جہاں اردو سرکاری زبان ہے۔ ہندوستان کی پانچ مزید ریاستیں ایسی ہیں جہاں اردو دوسری سرکاری زبان ہے۔ ان تمام ریاستوں کے اردو مرکزوں میں اردو تہذیب وتمدن کا احاطہ کیا جانا بھی غلط نہیں ہوگا۔ ممبئی جس نے اردو ادباء اور شعراء کی بہت بڑی جماعت کو پناہ دی اور انہیں Celebrity بنادیا۔ فلم نگری میں اردو تہذیب کیسے رواں دواں ہے، اس پر بھی بات ہونی چاہئے۔ کلکتہ سے لے کر بنگلور تک شائع ہونے والے اردو اخبارات کے دفتروں اور بالخصوص وہ اخبارات جو اپنے انگریزی اور ہندی اخبارات کے زیر سایہ شائع ہورہے ہیں، ان دفاتر میں اردو کس حال میں ہے، یہ بھی ڈسکورس کا موضوع بنتا ہے لیکن افسوس کہ ابھی بھی یونیورسٹیوں کے شعبۂ اردو اس طرف توجہ نہیں دے رہے ہیں۔

ہم اس دور میں پہنچ گئے ہیں جہاں اردو کے معروف ومقبول شاعر آئی آئی ٹی اور آئی آئی ایم کے طلباء کو اردو کے شعری فن پر لکچر دینے کے لئے جانے لگے ہیں۔ ریختہ، اردو چینل، عشق اردو جیسی ویب سائٹس غیر اردو داں طبقہ میں مقبولیت کے جھنڈے گاڑ رہی ہیں۔ اس سیاق وسباق میں اردو کی تحقیق کے موضوعات میں توسیع کی سخت ضرورت ہے۔ ہم نے انہیں چند نکات کی بنا پر مذکورہ یونیورسٹیوں پر رپورتاژ لکھوائے۔

نیادور ریختہ پر

'نیادور' کے شمارے

rekhta.org پر ملاحظہ کئے جاسکتے ہیں۔

دہلی کا ذاکرحسین کالج ہو یا شاہجہانپور کا گاندھی فیض عام کالج، اے ایم یو کے کئی کالج ہو یا لکھنؤ کا شیعہ کالج اور اسلامیہ کالج، کرامت حسین کالج، ممتاز کالج سمیت بے شمار ایسے تعلیمی ادارے ہیں جن کی بنیاد میں اردو تہذیب شامل رہی ہے لیکن ظاہر ہے کہ ان تمام اداروں کے کیمپس میں رچی بسی اردو کا حال واحوال بیان کرنا ایک شمارے کے بس کی بات نہیں۔ یہ ایک پروجیکٹ ورک ہے اور ہمیں امید ہے کہ نیادور کے اس شمارے کے بعد یونیورسٹیوں میں اسے تحقیق کا موضوع ضرور بنایا جائے گا۔

بات صرف تعلیمی اداروں میں اردو تہذیب وثقافت تک محدود نہیں ہے۔ ہندوستان بھر میں بکھری پڑی اردو اکادمیوں اور دیگر اردو اداروں کے اندر اردو تہذیب کس انداز میں اور کس حد تک باقی رہ گئی ہے، اس کا بھی احاطہ کیا جانا چاہئے۔ ساہتیہ اکیڈمی، نیشنل بک ٹرسٹ اور قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان جیسے مرکزی اداروں میں اردو تہذیب پر بھی لکھا اور لکھایا جانا چاہئے۔ ہم نے اپنی وساطت میں جتنی گنجائش تھی اس تناسب میں اس سلسلہ کی شروعات کر دی ہے۔ باقی ماندہ کام ہم دوسروں پر چھوڑتے ہیں لیکن اس موضوع پر ایک وسیع کینوس میں کام کرنے کی اشد ضرورت ہے۔

ہمیں یہ بتاتے ہوئے فخر محسوس ہورہا ہے کہ اردو کے مایہ ناز بزرگ مزاح نگار مجتبیٰ حسین صاحب نے فروری ۲۰۱۸ء کے نیادور کے شمارے کی زبردست تعریف کی۔ انہیں جب رسالہ ملا تو انہوں نے فوراً فون کیا اور کہا کہ میں اس کو دیکھ کر اس قدر خوش ہوں کہ پڑھنے سے پہلے ہی اس کی تعریف کر رہا ہوں۔ انہوں نے 'نیادور' کے لئے جلد ہی اپنی مزاحیہ تحریریں بھیجنے کا وعدہ کیا ہے حالانکہ اب وہ لکھنا ترک کر چکے ہیں۔

نیادور کا فروری کا شمارہ ریختہ کے فاؤنڈر جناب سنجیو صراف کو بھی ذاتی طور پر پیش کیا گیا تاکہ وہ نیادور کے نئے آہنگ سے روشناس ہوسکیں۔ انہوں نے بھی اس کی کافی ستائش کی۔ ہماری کوشش جاری رہے گی کہ نیادور کو ہم ہر اس جگہ، اس مقام اور اس خطے تک پہنچائیں جہاں جہاں اردو موجود ہے۔ نیادور کے سرورق کے اندرونی حصہ پر مشاہیر ادیبوں اور شاعروں کی تاریخ ولادت ووفات سے متعلق شائع جدول قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے کلینڈر سے ماخوذ ہے لہٰذا تاریخی اغلاط کے لئے 'نیادور' کسی طرح کا ذمہ دار نہیں ہے۔

قارئین 'نیادور' کے شمارے مئی ۲۰۱۷ء تا فروری ۲۰۱۸ء www.information.up.nic.in پر ملاحظہ کر سکتے ہیں۔

عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَالَمْ یَعْلَمْ

انسان کو وہ سب بتا دیا جو اسے نہیں معلوم تھا

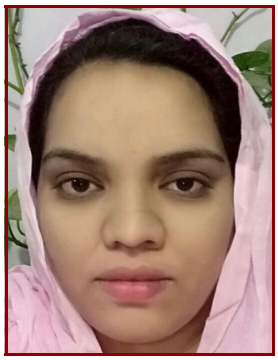

صالحہ صدیقی

ساتکتابوں کی مصنفہ

علامہ اقبال پر ڈرامہ اور مختلف جرائد میں مضامین کی اشاعت، 'علامہ اقبال کی شاعری میں ڈرامائی عناصر' کے موضوع پر جامعہ ملیہ اسلامیہ کے شعبۂ اردو سے پی ایچ ڈی کے مقالے کی تکمیل میں مصروف، بنیادی طور پر افسانہ نویس اور ڈرامہ نگار، وطن اعظم گڑھ

157/12، راجہ پور، الٰہ آباد

رابطہ: 9899972265

آج میری زندگی کا بہت اہم دن تھا، بڑی مشکل سے امی ابو نے گھر سے اتنی دور جامعہ ملیہ اسلامیہ، دہلی میں پڑھنے کی اجازت دی تھی۔ میں جتنی خوش تھی، اتنی ہی اندر سے ڈری ہوئی بھی تھی کہ نہ جانے کیا ہوگا؟ وہاں لوگ کیسے ہونگے؟ استاد کیسے ہونگے؟ طالب علم کیسے ہونگے؟ مجھے نہ تو وہاں کے کلچر کا کچھ علم تھا نہ رہن سہن کا، بار بار اس بات کا ڈر ستا رہا تھا کہ کہیں میں مذاق نہ بنائی جاؤں؟ کوئی جان پہچان نہیں، کیسے اور کس سے بات کروں گی؟ کیا وہاں بھی گائڈ کے علاوہ کسی دوسرے استاد سے بات کرنے پر مصیبت ہوگی؟ میں اسی کشمکش میں الجھی ہوئی تھی کہ آٹو رکشہ والے نے کہا، 'جامعہ آ گیا' میری نظر ایک اونچے لمبے مسجد کے مینار نما جالی دار گیٹ پر پڑی جس پر بڑے بڑے لفظوں میں لکھا تھا ''مولانا ابوالکلام آزاد باب'' جالی دار کالے پھاٹک پر اسٹیل کی پلیٹ پر، بڑی ہی خوبصورتی سے چاند کے پیٹ سے دو کھجور کے پیڑ میں بنی کتاب پر لکھا تھا ''علّم الانسان مالم یعلم'' اور اس کے سر پر ایک ستارہ چمک رہا تھا جس پر لکھا تھا ''اللہ اکبر'' ہرے ہرے حروف میں لکھے یہ الفاظ ہر راہ گیر کو علم کی دعوت دے رہے تھے۔

میری نگاہ جیسے ہی دوسرے گیٹ پر پڑی تو وہاں بھی لکھا تھا ''علّم الانسان مالم یعلم'' میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب میں نے دیکھا کہ جامعہ میں یونیورسٹی کا ہر گیٹ اردو کی کسی نہ کسی معروف شخصیت کے نام سے موسوم ہے۔ ایک طرف قرۃ العین حیدر اپنے دونوں گالوں پر ہاتھ رکھے آنکھوں میں چمک لیے مسکراتے ہونٹوں سے علم کی دعوت دے رہی تھیں اور دوسری طرف محمد حسن تو تیسری طرف امیر خسرو سب کی سرپرستی کرتے ہوئے نظر آرہے تھے۔ ارے واہ کیا بات ہے! پیشانی پر اپنی پریشان زلفیں بکھیرے طلباء کو خواب سے بیدار کرنے کے لیے اے۔ پی۔ جے ابوالکلام بھی کھڑے ہیں، گیٹ کی چمک دمک سے اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ اس ''باب'' فیملی میں نئے نئے شامل ہوئے ہیں۔ فضا میں اردو کی بھینی بھینی خوشبو بکھری ہوئی تھی۔ میں یہ سب سوچتے سوچتے کسی طرح سڑک پار کر کے ''مولانا ابوالکلام آزاد'' گیٹ پر پہنچی۔ شعبۂ اردو کی طرف جانا تھا لیکن نہ جانے کیوں میں نے گارڈ سے سنٹرل کینٹین کا راستہ پوچھا جو اپنی گول مٹول توند کو سنبھالے بمشکل اسٹول پر بیٹھے ہوئے تھے۔ سنٹرل کینٹین جانے کے لئے جیسے ہی میں نے

اپنا پہلا قدم زینے سے نیچے رکھا سامنے غالب چچا اپنے خاص انداز میں ایک ہاتھ سے اس طرح اشارہ کرتے ہوئے کھڑے تھے جیسے ابھی بول اٹھیں گے، غزل کا مطلع ارشاد فرمائیں اور دوسرے ہاتھ میں کھلی ہوئی کتاب لیے ،اپنے مخصوص لباس گھیر دار لمبی شیروانی اور چوڑا پاجامہ سر پر ٹوپی لگائے خوبصورت باغ میں جس کا نام بھی ان کے نام پر ''گلشن غالب'' تھا، پوری شان و شوکت سے کھڑے تھے، ان کی ٹوپی پر کبھی چڑیا تو کبھی کبوتر بھی آ کر بیٹھ جاتا، موسم بہار کی وجہ سے نظارہ اور بھی دلکش ہو رہا تھا، ہلکی ہلکی ٹھنڈی میں گنگنی دھوپ کا لطف لینے کے لیے طلباء گارڈن میں بیٹھے ہوئے تھے ۔ ہر طرف خوبصورت پھولوں کی دلکش کیاریاں ، ہری بھری گھاس اور چاروں طرف پیڑ پودے جیسے آنکھوں کو سکون پہنچا رہے تھے۔ پھولوں کی بھینی بھینی خوشبو سے سارا ماحول معطر تھا ایسا لگ رہا تھا جیسے غالب چچا ان سے باتیں کرتے ہوئے ہر اندر آنے والے کا خود استقبال کر رہے ہوں۔ گارڈن میں بکھرے طلباء میں کوئی پڑھائی لکھائی میں مشغول تھا تو کوئی گروپ میں بیٹھا مستی کر رہا تھا، تو کوئی آپس میں ایک دوسرے کے منھ پر کیک لگا کر اپنے یوم پیدائش کا جشن منا رہا تھا۔ ہر طرف آنے جانے والوں کا سلسلہ جاری تھا کہ اچانک میری نظر چند لڑکیوں پر پڑی زمین کو چھو کر گھسیٹتا ہوا نقاب، جس پر بڑے ہی انوکھے، خوبصورت اور دلکش انداز میں اسکارف باندھے، جس میں رنگ برنگی چمکتی ہوئی اسکارف پنس بڑے ہی سلیقے سے لگی ہوئی تھیں، آنکھوں میں گہرا کاجل ،موٹے موٹے آئی لائنر، ہونٹوں پر ہلکی سرخی جوان کی خوبصورتی میں چار چاند لگا رہی تھی، ہائی ہیلس پہنے خود کو سنبھالتے ہوئے ایک ہاتھ میں رجسٹر تو دوسرے ہاتھ سے اپنے چھوٹے سے پرس کے لمبے چین نما ہنڈل کو کاندھے پر لٹکائے بڑی نزاکت سے ہنستی کھل کھلاتی ،اپنی ہی دنیا میں مست مگن چلی جا رہی تھیں۔ لڑکے کہیں شیروانی میں تو کوئی کرتے پائجامے میں، کوئی ٹی شرٹ اور پینٹ میں تو کوئی جینس اور ٹی شرٹ میں لمبی داڑھی رکھے سر پر ٹوپی

لگائے چلا جا رہا تھا، ان میں کچھ حضرات تو ایسے بھی تھے کہ جن کو دیکھ کر ایسا لگا جیسے جناب بستر سے اٹھ کر سیدھے یونیورسٹی آ گئے ہوں، نہ کوئی اہتمام اور نہ کوئی پروا کہ کون کیا سوچ رہا ہے یا کیا سوچے گا؟

لنچ کا وقت ہو چکا تھا۔ کینٹین کے کاؤنٹر پر ٹوکن لینے کے لئے طلباء کی بھیڑ تھی، لیکن اس بھیڑ میں بھی ایک دوسرے کو سلام کرنے کی رسم جاری تھی ۔''السلام علیکم'' کیسے ہیں؟ بہت دنوں بعد ملاقات کا شرف حاصل ہوا بھائی! کہاں تھے؟ وعلیکم السلام، ہاں یار! گھر گیا تھا۔ اتنی سی بات کرنے میں دھیان جیسے ہی ہٹا ان کا ہاتھ کسی نے ہٹاتے ہوئے اپنا ہاتھ کاؤنٹر کی طرف بڑھا دیا، ابھی یہ جناب کچھ کہہ پاتے کہ اتنے میں ''ساری بھائی'' کہہ کر ہاتھ ہٹانے والے نے معذرت بھی کر لی۔ ایک اچھی بات مجھے یہ دیکھنے کو ملی کہ کاؤنٹر پر لڑکوں کے ساتھ حجاب میں ایک لڑکی بھی ٹوکن کاٹ رہی تھی، طالب علم بھی لڑکیوں کو اس بھیڑ میں پہلے ٹوکن لینے کے لیے جگہ دے رہے تھے، اس ادب و احترام کا نظارہ میرے لیے بڑا ہی دلچسپ تھا۔ اتنے میں ظہر کی اذان کی آواز سنائی دی اور اسی کے ساتھ لڑکے اپنی اپنی جیب سے ٹوپی نکالتے ہوئے مسجد کا رخ کرنے لگے اور بھیڑ کم ہو گئی۔ میں نے بھی کاؤنٹر سے چائے کا ٹوکن لیا اور بیٹھنے کی جگہ ڈھونڈھنے کے لیے نظر دوڑانے لگی۔ ایک طالبہ نے شاید میری نظروں کو پڑھ لیا، وہ میرے قریب آئی اور اس نے کہا'' آپ اس زینے سے اوپر چلی جائیے، آپ کو وہاں بیٹھنے کی جگہ مل جائے گی'' اوپر جا کر میں نے اپنی چائے کا ٹوکن کھڑکی کے اندر بڑھا دیا اور چند لمحوں میں چائے حاضر۔ چائے لے کر میں اس زینے کے پاس پہنچی تو ایک گارڈ صاحب ہرے رنگ کی وردی میں لکڑی کی کرسی پر بیٹھے چائے کی چسکیاں لے رہے تھے، دیوار پر ایک کاغذ پر اردو میں لکھا چسپاں تھا کہ

''لڑکوں کا اوپر جانا سخت منع ہے۔''

میں زینے سے اوپر پہنچی تو دیکھا ایک لیڈی گارڈ بھی سادے کپڑوں میں بیٹھی تھیں، میں جیسے ہی چھت کی طرف بڑھی لیڈی گارڈ نے روکتے ہوئے کہا، اوپر نہیں جانا بچّی !اور اشارہ کرتے ہوئے کہا چھت پر بچیوں کا جانا منع ہے، اندر جائیے، (دھیمی آواز میں بڑبڑاتے ہوئے) روز ایک ہی بات سب کو سمجھانی پڑتی ہے میں گلیارے سے اندر داخل ہوئی تو داہنی جانب شیشے کی دیوار تھی جہاں

لڑکیاں آرام سے کرسی پر بیٹھ کر باہر کے نظاروں کا لطف لے رہی تھیں۔ سامنے ہال میں داخل ہوتے ہی ایک ایسی دنیا دیکھی جس میں صرف لڑکیوں کا راج تھا۔ اس ہال میں بہت ساری رنگ برنگی کرسیاں اور میز لگی ہوئی تھیں۔ دیواروں پر خوبصورت آئینے آویزاں تھے، لڑکیاں سج سنور رہی تھیں، ایک طرف واش روم تھا جس میں وضو کرنے کی جگہ اور بڑے بڑے آئینے تھے جہاں کوئی اپنے بال سنوار رہا تھا تو کوئی اپنے اسکارف کی پن صحیح کر رہا تھا، کچھ لڑکیاں ایک دوسرے کا میک اپ ٹھیک کر رہی تھیں اور ایک دوسرے کو گھوم گھوم کر خود کو دکھا کر تسلی دے رہی تھیں:

'میں اچھی لگ رہی ہوں نا؟ پلیز صحیح سے دیکھو نا؟ میک اپ ٹھیک ہیں نا؟ ہاں یار! لاپروائی سے دوسری لڑکی نے کہتے ہوئے کہا تمہیں تو اپنی ہی پڑی ہیں مجھے دیکھو نا! میں کیسی لگ رہی ہوں میک اپ ٹھیک ہیں نا'

ایک طرف یہ نظارہ تھا تو دوسری طرف چبوترے پر لڑکیاں آرام سے بیٹھ کر وضو کر رہی تھیں۔ پورا ہال پرفیوم اور میک اپ کی خوشبو سے مہک رہا تھا۔ واش روم کے بغل میں ایک بڑا سا روم تھا جس میں جا نماز نما کارپٹ لگا تھا۔ اس کمرے میں لڑکیاں نماز پڑھ رہی تھیں۔ ہر کوئی خاموش اپنے رب کی عبادت میں ڈوبا، اپنے خدا کی بارگاہ میں سر بہ سجود تھا۔ میں خاموشی سے اس کمرے سے باہر آ گئی اور خالی میز کے اردگرد لگی کرسیوں میں ایک کرسی پر بیٹھ گئی اور تقریباً ٹھنڈی ہو چکی چائے کی چسکیاں لینے لگی کہ اچانک کچھ لڑکیوں کا جھنڈ آ کر ٹیبل کے اردگرد خالی کرسیوں پر بیٹھ گیا۔ ان میں سے ایک لڑکی کسی سے یوں گویا ہوئی، ارے یار! میرے گھر میں تو کبھی اردو کا ماحول ہی نہیں رہا۔ بچپن سے انگلش میڈیم اسکول میں پڑھائی کی، کیا پتہ تھا کہ جامعہ میں آ کر اردو بھی سیکھنی پڑے گی۔ بچوں کی طرح الف، ب، پڑھنا پڑے گا۔ مجھے تو یہ آڑی تیڑھی لکیریں سمجھ میں ہی نہیں آتیں۔ اُف...ف (اپنے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے) تبھی دوسری لڑکی بول اٹھی، یار میں تو ہسٹری سے آگے پڑھنا چاہتی ہوں پھر کیا مطلب ہے ایک سال زبردستی اردو

پڑھنے کا (اچانک لہجہ بدلتے ہوئے مسکراتے ہوئے چہک کر بولی) لیکن ایک بات تو ہے یار! شعر بڑے اچھے لگتے ہیں، اردو بولنے میں کتنی پیاری لگتی ہے۔ ابھی بات پوری بھی نہیں ہوئی تھی کہ تیسری لڑکی نے بولنا شروع کر دیا بھئی جو بھی ہو مجھے تو بڑا مزہ آتا ہے اردو سیکھنے میں

ویسے بھی ہمیں تو یہ زبان آنی بھی چاہیے، مجھے تو...(دماغ پر زور دیتے ہوئے) اسے کیا کہتے ہیں، ہاں! ''مشاعرہ'' وُشاعرہ سننے میں بھی بڑا مزہ آتا ہیں واہ...واہ کیا بات ہے...بہت خوب...(مشاعرے کی نقل کرتے ہوئے کہتی ہے) اچانک سنجیدہ ہوتے ہوئے لڑکی کہتی ہے! میں تو شاعری کرنا بھی سیکھونگی، کیسے لکھتے ہیں؟ ارے عظمیٰ! تم نے تو لکھی بھی ہے نا...ان میں بیٹھی لڑکیوں میں ایک لڑکی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتی ہے جو بڑی سنجیدگی سے بیٹھی سب کی باتیں خاموشی سے سن رہی تھی، اپنا نام سنتے ہی چہک کر بولی، ہاں ہاں! مجھے تو بہت شوق ہے یار، یہ تو کتنی اچھی بات ہے کہ جن لوگوں نے ہائی اسکول تک اردو نہیں پڑھی ان کو بی۔اے میں لازمی پرچے کے طور پر اردو پڑھائی جاتی ہے خواہ وہ کسی بھی سبجیکٹ کے ہوں۔

میرا تو بچپن سے خواب تھا اردو سیکھنے کا لیکن کبھی موقع ہی نہیں ملا، جامعہ آ کر میرا یہ خواب پورا ہو گیا۔ یہاں کے اردو ڈپارٹمنٹ میں تو ٹیچرس شاعری بھی کرتے ہیں، میں تو ان سے ضرور سیکھونگی اور جو کچھ میں نے لکھا ہیں ان کو دکھاؤں گی۔ یار! شاعری میں کتنی فلاسفی ہوتی ہے نا، ہزاروں لاکھوں خیالوں کو شعر کی دو لائن میں لکھ دیا جاتا ہے (اسی وقت ایک لڑکی بول اٹھی) بھئی مجھے تو بہت گھبراہٹ ہوتی ہے، سارے الفاظ ایک سے لگتے ہیں اوپر سے الفاظوں کا تو گروپ ہوتا ہے۔ اب 'ب' کو ہی لے لو، لکھے سارے ایک جیسے ہی جاتے ہیں بس بندی کا فرق ہوتا ہے۔ ب، پ، ت، ٹ، پتہ یہ چلا کہ دو سے تین بندی ارے اسے کیا بولتے ہیں (دماغ پر زور دیتے ہوئے) ہاں 'نقطہ' ایک بھی زیادہ لگ گیا تو گئی بھینس پانی میں، ارے وہ مصرعہ بھی ہے نا کہ نقطے کے ہیر پھیر سے خدا جدا ہوا۔ (یہ سنتے ہی سب نے ایک ساتھ قہقہہ لگایا) لیکن کچھ بھی ہو اردو کی کلاس میں مزہ خوب آتا ہے۔

ان کی باتیں سنتے سنتے میں نے اپنی چائے ختم کی اور کپ کو کوڑے دان میں ڈالنے گئی تو وہاں بھی بڑے بڑے حروف میں اردو میں لکھا چسپاں تھا کہ

'صفائی نصف ایمان ہے، برائے مہربانی کوڑا کوڑے دان میں ڈالیں' میں ہال سے باہر آ گئی اور دیکھا جگہ جگہ کوڑے دان اور اردو میں صفائی ستھرائی کا خاص خیال رکھنے کے لئے نوٹس بھی لگائے گئے تھے، ہر طرف انگلش اور اردو میں ''کلین جامعہ'' اور ''گرین جامعہ'' کے بورڈ کے ساتھ 'اسموکنگ فری ایریا'' کا بھی بورڈ لگا تھا۔ میں یہ دیکھ کر حیران تھی کہ میں جس سمت جاتی ہر شعبہ ہر نوٹس بورڈ ہر تاکید کو انگریزی اور اردو زبان میں لکھا گیا تھا۔ جس طرف بھی قدم اٹھتے خوبصورت رنگ برنگے پھولوں کی کیاریاں استقبال کرتیں اور راستہ پھولوں کی خوشبوں سے معطّر ملتا۔ کینٹین سے ایک سیدھا راستہ ذاکر حسین لائبریری کی طرف نکل رہا تھا، میں اس راستے سے لائبریری کے لیے چل پڑی۔ لائبریری کے ٹھیک سامنے ایک چھوٹا سا تکونہ پارک بھی تھا جس میں سیاہ رنگ کا بڑا سا پتھر نصب تھا جس پر تقسیم ہند کے مہلوکین کی یاد میں ڈاکٹر ذاکر حسین کے بیش قیمتی الفاظ کندہ تھے۔

لائبریری کی بلڈنگ لال پتھروں سے گھماؤدار گول جالی دار قدیم وجدید فن تعمیر کا خوبصورت نمونہ تھی جس پر اسٹیل سے بڑے بڑے حروف میں ایک طرف اردو اور ایک طرف انگریزی میں لکھا تھا ''ذاکر حسین لائبریری'' لائبریری کی اونچی اونچی محل نما دیوار پر ایک طرف جنگ آزادی کے مجاہدین کی تصویریں نصب تھیں تو دوسری طرف جامعہ کے بانیوں ڈاکٹر ذاکر حسین، محمد علی جوہر اور محمد مجیب جیسی ممتاز شخصیات کی تصاویر بھی آویزاں تھیں۔ دیوار کی ایک جانب شیخ الجامعہ کی تصویر اور ان کی خدمات کے ساتھ ساتھ جامعہ کی سرگرمیاں بھی نمایاں طور پر ملاحظہ کی جاسکتی تھیں۔ میری نظر اچانک ایک ٹیبل پر پڑی جس میں شیشے کے باکس میں جامعہ کی تاریخی اور تحقیقی کتابوں کو نمائش کے لیے رکھا گیا تھا۔ لائبریری میں ہر طرف نوٹس بورڈ اردو زبان میں لگائے گئے تھے۔

لائبریری کے گیٹ کے بائیں جانب بہت بڑا کمپیوٹر ہال تھا جس میں آن لائن کیٹلاگ موجود تھا۔ لائبریری کی دیوار پر ہر طرف جامعہ کے طلباء کی بنائی ہوئی خوبصورت طغرے آویزاں تھے۔ ان میں کچھ نہایت دلچسپ تھیں۔ اردو کے ضرب المثل اشعار کو کسی نہ کسی جانور کی تصویر میں خوش خط اور فنی طریقہ سے اتار دیا گیا تھا۔

اسی طرح کی کچھ پینٹنگ اردو کے ساتھ عربی اور فارسی زبان میں بھی بنائی گئی تھیں۔ سامنے کی جانب ہال میں اردو کے معیاری رسالوں کے قدیم سے قدیم تر مجلد مخطوطے بڑے ہی سلیقے سے ہوئے رکھے گئے تھے۔ لائبریری کے فرسٹ فلور پر قائم میوزیم کے بارے میں پڑھا جہاں ممتاز قلمکاروں کے ہاتھوں کے لکھے پرانے نایاب خطوط، قرآن مجید کے پرانے نسخے مختلف زبانوں کے رکھے گئے تھے۔

لائبریری سے باہر آنے پر بھوک کا احساس ہوا۔ عقب میں ''ایکتا دسترخوان'' پہنچی تو حیران رہ گئی کہ اس کینٹین میں کھانا بنانے سے لے کر ٹوکن کاٹنے اور کھانا دینے تک کا سارا نظام صرف لڑکیوں کے سپرد تھا۔ لڑکیاں شلوار سوٹ پہنے، سر پر سلیقے سے اسکارف باندھے بڑے ہی جوش وخروش سے کھانا دے رہی تھیں۔ کالے کالے پتھروں سے بنی لمبی لمبی میز اور کرسیاں طلباء سے بھری ہوئی تھیں۔ جامعہ کی یہ کینٹین لڑکیوں کے ذریعہ ہی چلائے جانے کے لئے وقف کی گئی ہے۔ ہر طرف اردو کے بورڈ اور بول چال میں اردو کا زیادہ سے زیادہ استعمال۔ میں نے بھی گرما گرم کھانے کی تھالی لی اور کھانے میں مشغول ہوگئی۔

اچانک سامنے کی جانب ایک لڑکے نے آکر دوسرے لڑکے کے کاندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا، ارے شعیب! کیسے ہو بھائی؟ بڑے دنوں بعد دیدار ہوئے، بھائی کہاں تھے؟ بس ایسے ہی اور تم بتاؤ تمہاری شعر وشاعری کیسی چل رہی ہے؟ تم اتنی اچھی شاعری کرتے ہو یار! یقین نہیں ہوتا کہ جیوگرافی کے اسٹوڈنٹ ہو کر بھی اردو میں اتنی اچھی شاعری کر لیتے ہو، تمہارے پڑھنے کے انداز سے تو کوئی نہیں کہہ سکتا کہ تم اردو سے نہیں ہو۔ لمبی داڑھی کرتا پاجامہ پہنے لڑکے نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ارے بھائی کہاں، آپ تو خواہ مخواہ تعریف کے پل باندھ رہے ہیں، بس ایسے ہی تھوڑی موڑی کوشش کر لیتا ہوں (دوسرے لڑکے نے مسکراتے ہوئے کہا، آگے بولتے ہوئے) تمہیں تو پتہ ہی ہے یہاں جامعہ میں اتنے مشاعرے اور اردو سے متعلق مختلف پروگرام مثلاً بیت بازی، شعروشاعری کے مقابلے، اور دیگر اردو سے متعلق لکھنے پڑھنے کے مقابلے کرائے جاتے ہیں اردو میلہ، میراث، آبشار جو خصوصا ہر شعبے کے طالب علموں کے لیے کرائے جاتے ہیں۔ میں بھی ان میں حصہ لے لیتا ہوں اور اپنے شعروشاعری کے شوق کو پورا کر لیتا ہوں۔

میرے لئے یہ سب کچھ ایک نیا تجربہ تھا۔ میں یہ دیکھ کر بھی حیران تھی کہ ان لڑکوں کی شباہت سے لمبی لمبی داڑھی، کرتا پاجامہ اور آنکھوں میں سرمہ دیکھ کر ایسا لگ رہا تھا جیسے یہ کوئی عالم فاضل، مولوی یا حافظ ہونگے لیکن وہ یونیورسٹی کے مختلف شعبوں سے تعلق رکھنے والے طلباء تھے جن کو اردو پڑھنی بھی نہیں آتی تھی لیکن اردو سے ان کا والہانہ محبت ہی تھی کہ دیگر سبجکٹ کے ہونے کے باوجود اردو کا دامن تھامے ہوئے تھے، ان کے انداز گفتگو اور طور طریقے سے کوئی اردو داں بھی ان پر شبہ نہیں کر سکتا تھا کہ یہ اردو کے طالب علم نہیں ہیں۔ عموماً اس طرح کے لڑکوں کو دیکھ کر لوگ غلط فہمیاں پال لیتے ہیں کہ یہ اردو یا قرآن وحدیث یا اسلامیات کے ماہر ہونگے جیسا کہ پہلی نظر میں مجھے بھی یہی گمان ہوا تھا لیکن ان کی باتیں سننے کے بعد میری یہ غلط فہمی بھی دور ہوگئی کہ ہر کرتا پاجامہ اور داڑھی والا بندہ مولوی یا حافظ نہیں ہوتا۔ میں شکم سیر ہو کر کینٹین سے باہر آ گئی۔

باہر آنے کے بعد میں ''فیکلٹی آف ہیومنیٹیز اینڈ

لینگویجز'' کی طرف پہنچی تو دیکھا کہ یہاں کے بورڈ بھی اردو اور انگریزی زبان میں نصب تھے۔ میں گیٹ کے اندر داخل ہوئی تو گارڈ صاحب سے ایک لڑکا بات کر رہا تھا، گیٹ سے گزرنے والا ہر طالب علم گارڈ کو سلام کر رہا تھا اور سیدھا کیمپس میں گھس جاتا، میں نے دل میں سوچا اس سے پہلے کہ مجھے پھر سوالوں کے کٹگھرے میں کھڑا کیا جائے میں نے بھی بڑے ادب سے سلام کیا۔ گارڈ صاحب نے مسکراتے ہوئے جواب دیا اور میں بنا کسی خلل کے اندر آ گئی۔

سامنے کی دیوار پر ''گلشن خسروؔ'' انگریزی اور اردو میں کندہ تھا۔ یہاں کے ہر شعبے کے باہر ایک خوبصورت گارڈن بھی بنایا گیا ہے اور ہر گارڈن کا نام بھی اردو کی معروف شخصیات کے نام پر رکھا گیا ہے۔ میری نگاہیں شعبۂ اردو کو ڈھونڈھ رہی تھیں۔ سفید نیلی پٹیوں میں رنگی بلڈنگ میں ایک تین منزلہ عمارت تھی قدرے مختلف نظر آ رہی تھی۔ اس کے ٹھیک سامنے دونوں طرف دیوار پر پتھروں سے تراشے ہوئے، دو مجسموں کے درمیان سے ہوتے ہوئے آگے بڑھی تو سامنے ایک گیٹ تھا جس پر ''باب خسروؔ'' لکھا ہوا تھا۔ اندر جانے والے راستے پر ایک پٹی پر لکھا تھا ''دبستان حضرت نظام الدین اولیاءؒ'' چند قدم سیدھا چلنے پر راستہ داہنی طرف مڑ رہا تھا، مڑتے ہی اس بلڈنگ کے اوپر ہرے ہرے لفظوں میں لکھا تھا ''شعبۂ اردو'' شعبہ کے سامنے چھوٹی سی دیوار پر ایک پتھر پر سیاہ لفظوں میں غالب کا یہ شعر کندہ تھا۔

کیا فرض ہے کہ سب کو ملے ایک سا جواب
آؤ نہ ہم بھی سیر کریں کوہ طور کی

دوسری طرف میر تقی میرؔ کا بھی ایک شعر دیوار پر رکھے پتھر پر کندہ تھا۔

اس کے فروغ حسن سے جھمکے ہے سب میں نور
شمع حرم ہو یا کہ دیا سومنات کا

شعبے کے اندر سب محو گفتگو تھے۔ ایک جناب اپنے ناک پر رکھے چشمے سے جھانکتے ہوئے گردن ہلکی سی جھکائے پینٹ شرٹ پہنے، بال ہلکے بکھرے ہوئے اپنی دونوں ابرو کو ملا کر لیکن لہجے میں خوش مزاجی سے بولے، ارے بھئی کہاں ہو آج کل، دکھائی نہیں دے رہے، سب ٹھیک ٹھاک ہے نا، کام کیسا چل رہا ہیں؟ اس شخص کی آواز سنتے ہی آس پاس کھڑے سارے طالب علم ان کے پاس جمع ہونے لگے ''جی السلام علیکم سر'' اس لڑکے نے دیکھتے ہی بڑی گرم جوشی سے کہا۔ ''ہاں وعلیکم... کیسے ہو؟ دعائیں ہیں سر۔ سر کا لفظ سنتے ہی میں حیران رہ گئی کہ یہ سر ہیں جو اتنے نرم لہجے اور دوستانہ انداز میں اپنے شاگردوں سے بات چیت کر

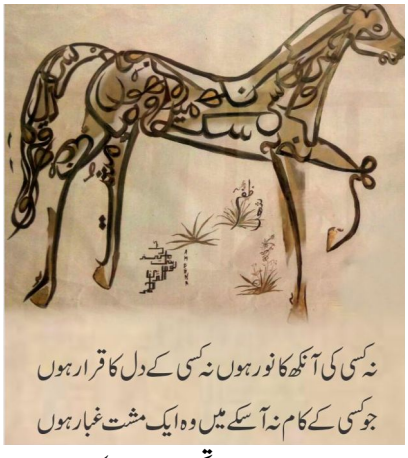

نہ کسی کی آنکھ کا نور ہوں نہ کسی کے دل کا قرار ہوں
جو کسی کے کام نہ آ سکے میں وہ ایک مشت غبار ہوں

رہے ہیں۔ پھر میرے اندر تجسس ہوا کہ یہ کون ہیں میں نے ایک طالبہ سے پوچھا تو وہ میرے سوال پر حیران ہوتے ہوئے کہنے لگی آپ ان کو نہیں جانتیں یہ تو عالمی شہرت یافتہ ناول نگار اور مغربی ادب کے ماہر ہیں۔ یہ سنتے ہی میرا منھ کھلا کا کھلا رہ گیا کہ جن کے چرچے میں اب تک فکشن کی دنیا میں سنتی آئی تھی، جن کے فلسفیانہ ناول میں ابھی تک کتابوں میں پڑھتی تھی، آج وہ میری نظروں کے سامنے کھڑے ہیں اور اتنے مشفقانہ انداز میں طالب علموں سے گفتگو کر رہے ہیں جتنا بڑا نام اتنی ہی سادہ لوح شخصیت۔

''آپ کا نیا ایڈمیشن ہیں یہاں؟'' اس لڑکی نے مجھ سے پوچھا

''جی''

اسی لئے آپ کو حیرت ہو رہی ہوگی ہم بہت خوش قسمت ہیں اس معاملے میں، استاد اور شاگردوں کے میل جول کا ایسا ماحول آپ کو اور کہیں نہیں دیکھنے کو ملے گا، اچھا میں چلتی ہوں کلاس کا وقت ہو گیا خدا حافظ۔ یہ کہہ کر وہ لڑکی چلی گئی۔

میں سوچنے لگی کہ مجھے حیرت کیوں نہ ہوگی میں جہاں سے پڑھ کر آئی تھی وہاں تو استاد شاگرد، سینئر اور جونیئر میں ایک لمبی کھائی بنا دی گئی تھی، جسے پار نہیں کیا جا سکتا تھا، استاد سے بات کرنا ملک الموت کا سامنا کرنے کے برابر تھا۔ شعبے کے آفس میں داخل ہوتے ہی کسی کی آواز سنائی دی۔ شعبہ کا ایک ملازم بتا رہا تھا:

ہمارے یہاں کے اکیڈمک اسٹاف کالج میں دو طرح کے کورس ہوتے ہیں ایک ریفریشر کورس اور دوسرا اورینٹیشن کورس، ریفریشر کورس میں کسی ایک موضوع سے متعلق لکچر دیئے جاتے ہیں جب کہ اورینٹیشن کورس میں کالجوں کے اساتذہ کو مختلف علوم سے واقف کرایا جاتا ہے، اس کے علاوہ ہمارے یہاں گریجویشن کی سطح پر تین اقسام کی اردو پڑھائی جاتی ہے، پہلی ''ایلیمنٹری اردو'' یہ ان طالب علموں کے لئے ہے جنھوں نے اپنے اسکول میں بالکل اردو نہیں پڑھی لکھی، دوسرے ''اردو لینگویج'' یہ ایلیمنٹری اردو پڑھ کر آنے والے طلباء کے لیے ہوتی ہے اور تیسرے نمبر پر بی۔ اے پاس کورس میں اردو ادب کا ایک پرچہ لینا ہوتا ہے اور بی۔ اے (آنرز) میں کئی پرچے شامل ہوتے ہیں، ایلیمنٹری اردو چونکہ لازمی ہے اور یہ پرچہ بی۔ اے کے علاوہ بی کام اور بی۔ ایس۔ سی وغیرہ کے طلباء کے لئے بھی لازمی ہے اس لئے میں بہت زیادہ طالب علم ہوتے ہیں، ہر کلاس کے الگ الگ نصاب اور الگ الگ تقاضے اور ان کے الگ الگ مقاصد ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ ہمارے یہاں سرٹیفکیٹ کورس بھی ہوتے ہیں سمجھے برخوردار۔ ہمارے جامعہ

میں ہر طالب علم کو اردو پڑھنا نماز کی طرح فرض ہے۔

بات آگے بڑھی تو اس نے بتایا کہ طلباء میں اردو کا مزید شوق پیدا کرنے کے لیے بیت بازی، لفظ شماری، غزل سرائی، گیت فی البدیہہ، تقریری مقابلے کے ساتھ ساتھ مختلف سیمینار اور اردو پروگرام کرائے جاتے ہیں۔ ہمارے یہاں ڈرامہ کلب بھی ہے، اس کے علاوہ اسکالرس کا گروپ بھی چلتا ہے جس میں اردو کے مختلف موضوعات پر بحث ومباحثے ہوتے ہیں، اس گروپ میں ہمارے شعبے کے اساتذہ بھی شامل ہیں تاکہ طلباء کی بہتر رہنمائی ہوسکے۔

یہاں کے اسکالر تو بہت خوش قسمت ہیں کیونکہ ان کو ان کے موضوعات کے مطابق ہی نگراں دیئے جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہیں کہ ہمارے یہاں پی ایچ ڈی کرنے والے طلباء کا تحقیقی کام دیگر اداروں کے مقابلے اعلیٰ ومعیاری مانا جاتا ہے۔ جامعہ کا ہر فارم اردو اور انگریزی زبان میں ہوتا ہے، یہاں تک کہ اسٹاف ممبر کو بھی بیسک اردو آنی لازمی ہے۔ ہمارے یہاں کے استاد نے تو دہلی کے سابق گورنر نجیب جنگ کو بھی اردو سکھائی ہے۔ اس طرح کے نہ معلوم کتنے قصے اور باتیں ہیں جو جامعہ سے وابستہ ہیں۔

اسی وقت کالی پینٹ اور کوٹ پہنے ہلکی پیلے رنگ کی شرٹ اور ڈارک مرون رنگ کی ٹائی لگائے، وجیہ شکل وصورت، بلند قد وقامت اور ہلکی سی مسکراہٹ لیے تیز قدموں سے آفس میں ایک رعب دار شخص داخل ہوا جسے دیکھتے ہی سبھی ملازم اپنی کرسی چھوڑ کر اٹھنے لگے کہ اتنے میں آواز آئی بیٹھو... بیٹھو.... اشارہ کرتے ہوئے کہا، اور آفس سے کچھ کاغذی کاروائی کے بعد واپس چلے گئے، میں حیرت سے یہ نظارہ دیکھ رہی تھی ان کے جانے کے بعد میں نے پوچھا یہ جناب کون تھے؟ (ملازم نے حیرت سے جواب دیتے ہوئے کہا) آپ ان کو نہیں جانتی یہ ہمارے صدر شعبۂ اردو ہیں۔ عالمی شہرت یافتہ شاعر بھی ہیں۔ ان کو دیکھ کر کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ شاعر بھی ہیں۔ ہمارے صدر کی شخصیت جتنی شاہانہ ہے اتنی ہی فکر انگیزی ان کی شاعری بھی ہیں۔

داخلہ کی ضروری کارروائی مکمل کرنے کے بعد شعبہ کے باہر میں کرسی پر آکر بیٹھی ہی تھی ایک لڑکی کاندھے پر شال لٹکائے، دونوں شانوں پر بال بکھیرے، بندی لگائے، کانوں میں بڑے بڑے کالی چاندی کی جھمکے پہنے بڑی ہی نزاکت سے میرے ٹھیک سامنے والی سیٹ پر آکر بیٹھ گئی، اپنے بالوں کو ہاتھ کی انگلیوں سے سنوارتے ہوئے اس کی نظر مجھ پر پڑی تو وہ ہلکی سی مسکرائی پھر سنجیدہ ہوگئی۔ میں حیرانی سے یہ سوچنے لگی کی چند لمحوں والی دہلی کی یہ مسکراہٹ اصلی تھی یا نقلی؟ پھر اس نے اپنے پرس سے ایک پتلی کتاب نکالی تو میں حیران رہ گئی کہ شکل صورت اور برتاؤ سے ہندستانی انگریز لگنے والی اس لڑکی کے ہاتھ میں اردو کا ممتاز ڈرامہ ''انارکلی'' یہ دیکھ کر میں چونک گئی، پھر مجھے لگا کہ ہوسکتا ہے یہ بھی لازمی اردو کو سیکھ رہی ہو، پھر دل میں خیال آیا کیوں نا محترمہ سے بات کی جائے؟ بڑی ہمت کرکے میں اٹھی اور اس کے پاس گئی اور دھیرے سے بولی:

ہیلو...

ہائے... لڑکی نے نظر اٹھا کر پہلے تو مجھے سرسری نظر سے دیکھا پھر مسکراتے ہوئے کہا۔

میں بیٹھ جاؤں یہاں...؟

یس... یس... (اس نے اپنے بیگ کو سائڈ کرتے ہوئے کہا)

شکریہ، کہہ کر میں بیٹھ گئی۔ آپ اردو کی طالبہ ہیں؟ میں نے پوچھا

نو... نو... میں سول سروسیز کی تیاری کر رہی ہوں۔ جامعہ کا کوچنگ سنٹر ہے نا! سول کا! وہیں سے۔ اس لڑکی نے مسکراتے ہوئے کہا۔

یہ آپ کے ہاتھ میں دیکھا تو مجھے لگا آپ...

میں نے انارکلی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا

اوہ... یہ تو میں مینس کی تیاری کے لئے پڑھ رہی ہوں۔ لڑکی نے بات کاٹتے ہوئے کہا

اوہ اچھا..

جی ....جی... میں نے مینس کے لئے بطور اسپیشل سبجیکٹ اردو کا انتخاب کیا ہے۔

آپ نے اردو کا انتخاب کیوں کیا؟

دراصل سول میں اردو کا بہت چھوٹا سیلیبس ہوتا ہیں جس کو بہت آسانی سے کور کیا جاسکتا ہے وہ بھی کم وقت میں جن کو بیسک اردو کا بھی نالج ہے وہ تھوڑی محنت کر کے مینس کے لئے تیاری کر سکتے ہیں اور میں نے تھوڑی بہت اردو یہیں جامعہ سے گریجویشن میں سیکھ لی تھی تو اس لئے .....ویسے پچھلے کچھ سالوں سے سول میں اردو کا کریز بڑھا ہے۔

اردو زبان کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟

کچھ نہیں۔ یہ ایک اچھی لینگوج ہے، میں تو بس سول امتحان میں کامیابی حاصل کرنے کے مقصد سے پڑھ رہی ہوں، بس....

آپ کو کون سا شاعر پسند ہے؟

شعر وشاعری میں کوئی خاص دلچسپی نہیں ہیں۔ اس نے لاپروائی سے کہا، پھر اپنی گھڑی پر نظر دوڑاتے ہوئے بولی، مجھے کچھ کام یاد آگیا میں نکلتی ہوں، نائس ٹو میٹ یو...

'ویل آپ کو اور تو کچھ نہیں پوچھنا نا!' اچانک رکتے ہوئے اس نے پوچھا،

نو..... تھینک یو سو مچ۔ میں نے مسکراتے ہوئے کہا اور وہ لڑکی اپنا پرس اور کتاب سمیٹتی تیز قدموں سے ایسے گئی جیسے کہیں ہوا میں کہیں گم ہوگئی ہو۔

میں بیٹھی سوچ میں ڈوبی تھی کہ مجھے اپنے کاندھے پر کسی کا ہاتھ محسوس ہوا مڑ کر دیکھا تو ایک پرانی سہیلی کا مسکراتا ہوا چہرہ نظر آیا۔ 'ارے میڈم

یہاں کیسے؟' کہتے ہوئے مجھ سے گلے ملی ،میرا بھی ایڈمیشن ہوگیا ہے یہاں۔

اور بتاؤ، کیا چل رہا ہے؟ کیسی ہو؟ میں نے سوالوں کی جھڑی لگا دی ،میں ٹھیک ہوں ،میں ہاسٹل جارہی تھی تو میری نظر تم پر پڑی بہت دیر تک سوچا تم یہاں کیسے ہوگی لیکن پھر لگا نہیں تم ہی ہو اس لیے آ گئی، چلو نا تم بھی ہاسٹل خوب ساری باتیں کرینگے (اس نے ایک سانس میں بولتے ہوئے کہا) میں نے جانے سے انکار کیا تو وہ ضد کرتے ہوئے کہنے لگی، یار یہیں کیمپس میں ہی ہاسٹل ہے کینٹین سے سیدھی والی روڈ پر ہی، اتنے دنوں بعد ملی ہو چلو نا...

اس کے بار بار اصرار کرنے پر میں منع نہیں کر پائی اور اس کے ہاسٹل کی طرف ہم چل دیئے۔اس کے ہاسٹل کا نام ''بیگم حضرت محل گرلس ہاسٹل'' تھا۔اپنے نام کی طرح اس ہاسٹل کی چہار دیواری کے پیچھے وارڈن کا شاہی فرمان ہی چلتا تھا۔جہاں بنا اجازت پرندہ بھی پر نہیں مار سکتا تھا۔

گیٹ پر لمبی کاغذی کاروائی اور رجسٹر میں لمبی جانکاری کی لسٹ پُر کرنے کے بعد میں اپنی سہیلی کے روم میں پہنچی ،یہ تین بیڈ روم والا روم تھا جہاں ایک کمرے میں تین الگ الگ شعبے کی لڑکیاں ساتھ رہ رہی تھی۔میری سہیلی نے بتایا کہ اس کی ایک روم میٹ کیرل کی ہے تو دوسری آسام کی ،چونکہ میری سہیلی کو ان دونوں کی زبانیں نہیں آتی تھی اور انگریزی بھی بولنی نہیں آتی تھی۔اس نے بتایا کہ ان لوگوں سے بات چیت کا ذریعہ محض اشارہ اور کنایہ ہی ہیں جسے عرف عام میں باڈی لینگوئج کا نام دیا جاتا ہے لیکن سب سے زبردست جو باہمی رشتہ تھا وہ مسکراہٹ کا تھا۔

کچھ دیر بات چیت کرنے کے بعد ہم ڈائننگ روم میں گئے وہاں بھی سب اپنی اپنی دنیا میں مست کسی کو کسی سے کوئی سروکار نہیں تھا۔اپنی سہیلی سے گفتگو کے دوران پتہ چلا کہ اس پورے ہاسٹل میں اردو کی صرف دو طلباء رہتی ہیں جن کا روم بھی ایک دوسرے سے کافی دوری پر ہے۔پورا دن شعبے کے چکر کاٹنے کے بعد پڑھائی لکھائی سے تھک ہار کر جب وہ ہاسٹل پہنچتے ہیں تو ان کو آرام کرنے اور گھر والوں کو وقت دینے کے علاوہ کچھ نہیں دکھتا ،اس وقت میں وہ کسی اور کی مداخلت بھی نہیں چاہتے۔شاید یہی وجہ تھی کہ ہر کوئی صرف خود میں ڈوبا تھا۔البتہ نظر پڑتی تو ایک دوسرے سے ہائے ہیلو یا مسکرا کر کام چلا لیتے تھے۔

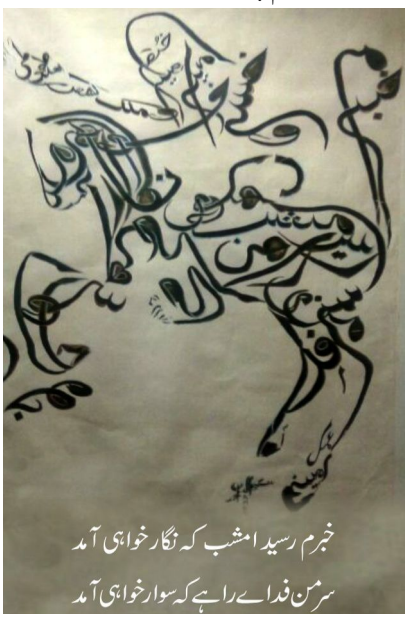

چونکہ شام ہونے کو آئی تھی باتوں باتوں میں وقت کا پتہ ہی نہیں چلا۔ایک بار پھر گیٹ پر طویل کاغذی خانہ پری کے بعد اس محل کی قید سے آزاد ہوئی۔راستے میں دن بھر کی سرگرمیاں میرے ذہن میں ایک بار پھر رقص کرنے لگی، مجھے ایسا لگ رہا تھا جیسے جامعہ ملیہ اسلامیہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے چھوٹے بھائی کی طرح ہے۔بڑا بھائی جو کُرتا پاجامہ اور سر پر ٹوپی لگائے بڑے بوڑھوں کا احترام، اپنے تہذیب وتمدن اپنی قدیم روایتوں کو نبھاتے ہوئے بڑی ذمہ داری سے آگے بڑھتا ہے جب کہ چھوٹا بھائی صرف کرتا پاجامہ ہی نہیں پہنتا بلکہ وہ قدیمی روایتوں کو ماننے کے ساتھ ساتھ بدلتے وقت کے بدلتے رنگ میں بھی خود کو ڈھال کر زمانے کے فیشن کے مطابق کبھی پینٹ بھی پہن لیتا ہے تو کبھی جینس اور کبھی موڈ ہوا تو کورٹ پینٹ بھی پہن لیتا ہے۔وہ کبھی شرارت بھی کرتا ہے تو کبھی اپنی معصومیت سے ہر ایک کا دل بھی جیت لیتا ہے۔چھوٹا بھائی ہونے کی وجہ سے گھر میں ہر کسی کا لاڈلا بھی ہے ۔چونکہ دونوں بھائیوں کی پرورش ایک خاص ماحول میں بڑے بوڑھوں کی سرپرستی اور نگرانی میں ہوئی ہے اس لیے وہ اپنے خاندان، اپنے معیار، اپنے رتبے، اپنی شان وشوکت کا خیال رکھنے کے ساتھ ساتھ اپنی ذمہ داریوں کو نبھانے کا بھی ہنر سے بھی بخوبی واقف ہیں۔وہ ایسا کوئی کام نہیں کرتے جس سے ان کی عزت پر حرف آئے۔

جامعہ کی سیر کرنے کے بعد اور اردو کا ماحول دیکھنے کے بعد ایسا لگ رہا تھا کہ جامعہ خود کہہ رہا ہو کہ:

'ہر باذوق انسان کے لئے
اردو سے واقفیت فرض ہے'

یہاں کی تاریخی جدید وقدیم فن تعمیر کی شاہکار عمارتیں یہ پیغام دے رہی تھیں کہ وقت کے ساتھ چلو لیکن اپنی تاریخ وتہذیب سے رشتہ بھی استوار رکھو۔

میرا ڈر، خوف ،اور سارے سوال جو آتے وقت میرے ذہن ودل میں طوفان برپا کر رہے تھے وہ تمام سوال اب ہوا میں گم ہو چکے تھے۔میں یہ تمام خیال اپنے دماغ میں لیے گیٹ تک پہنچ گئی اور مجھے احساس بھی نہیں ہوا، گیٹ سے باہر نکل کر میں نے آٹو رکشہ والے کو ہاتھ دکھا کر بلایا، میں رکشے پر بیٹھ کر گہری اطمینان کی سانس لی اور آٹو رکشہ والے نے اپنا میٹر گرا دیا۔

❑❑❑

علم و آگہی، مشاہدات و تجربات اور روایات کا خوبصورت امتزاج

سید محمد عقیل

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی

کے شعبۂ اردو میں ریسرچ اسکالر

مختلف موضوعات پر

مضامین کی اشاعت

وطن لکھیم پور

موضع کوٹہ مغل، محمد پور تاج پور

تحصیل، محمدی، لکھیم پور کھیری

رابطہ: 9415234101

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں داخلہ کے بعد باقاعدہ طور پر پہلا دن تھا، ابھی داخلہ کی ساری کاروائیاں مکمل بھی نہیں ہو پائی تھیں کہ اسی سلسلہ میں DSW کے دفتر کے کسی کام سے فارغ ہوکر چہل قدمی کرتا ہوا ازدو جانب لمبے لمبے سایہ دار درختوں سے گھری سڑک پر ہزار ہا خوابوں کو ذہن میں بسائے اپنی عارضی رہائش گاہ بدر باغ کا ارادہ کرکے نکلا ہی تھا، دن کے تقریباً ۱۲ بجے ہوں گے جیسے ہی سرسید شمالی ہال کے گیٹ کے سامنے پہنچا ایک بارعب آواز نے قدموں کی حرکت کو سکوت میں تبدیل کر دیا۔

بات سنئے جناب! اس درسگاہ میں نو وارد ہونے کے ساتھ ساتھ اجنبی بھی تھا۔ آواز کا تعاقب کرتی نظریں جب سامنے پہنچیں تو چار پانچ لڑکوں کا گروہ کھڑا تھا۔ یہ کیوں بلا رہے ہیں؟ کہیں RAGING تو نہیں لیں گے؟ اس نوعیت کے متعدد سوالات ذہن کے نہاں خانوں میں ابھرنے لگے ان سوالوں کی گتھیاں سلجھتیں اتنے میں پھر وہی آواز کانوں میں گونجی۔

'آپ ہی کو بلا رہے ہیں ادھر آیئے!'

بھاری قدموں سے سہما سہما ان کی جانب بڑھا تو خدشات کا سیاہ بادل ذہن کو اپنی مضبوط گرفت میں لے چکا تھا کیونکہ اے ایم یو میں Intro کی روایت کافی قدیم ہے اور خاکسار نے اپنے بڑوں سے اس کے بڑے قصے سن رکھے تھے کہ کس طرح سینئرس نو وارد طلبا سے ان کا تعارف لیتے ہیں ہر چند کہ یہ Intro مثبت ہوتا تھا اور اسی دورانیے میں نئے طلبہ کو یہاں کی تہذیب اور روایت سے مکمل آشنائی حاصل ہو جاتی تھی اور بعد میں اس کے بڑے خوشگوار نتائج بھی برآمد ہوتے تھے جس سے ایک گونہ مسرت حاصل ہوتی تھی مگر سینئرس کا یہ تعارفی طریق کار نئے طلبہ کے لیے کسی ناکردہ گناہ کی سزا کے احساس سے کہیں زیادہ تکلیف دہ اور ذہنی کوفت کا باعث ہوتا تھا۔ اس فکر میں مبتلا ہونا خاکسار کے لیے یوں بھی حق بجانب تھا کیوں کہ یونیورسٹی میں کسی سے شناسائی نہیں تھی۔

نئے ہیں؟

جی۔

کیا نام ہے؟ کہاں سے آئے ہیں اور کس کورس میں داخلہ ہوا ہے؟

خاکسار نے سوالوں کے بالترتیب جوابات دیئے۔ جواب سننے کے بعد ان کے لہجے کی نرمی اس بات کا اشارہ کررہی تھی کہ آخری جواب نے شاید انھیں کچھ متاثر کیا ہے۔Ph.D. اردو!

NET Qualified ہیں؟

جی بحمداللہ J.R.F. Qualify کیا ہے۔

ماشاءاللہ! کوئی پریشانی ہوتو بتایئے گا ناچیز کو اکرم حسین کہتے ہیں۔

جی بالکل شکریہ۔

ٹھیک ہے جایئے پھر ملاقات ہوگی، انشاءاللہ۔

جی انشاءاللہ ضرور۔ اتنا کہہ کر خاکسار اپنی منزل مقصود کی طرف روانہ ہوگیا۔

یہ اگست ۲۰۱۲ء کے آخری عشرہ کی بات ہے۔ تعطیل گرما کے بعد پورے کیمپس کا ماحول بڑا روح افزا تھا، ہرطرف کالی شیروانی سفید پائجامے زیب تن کیے طلبہ اور مختلف قسم کے برقعوں میں ملبوس طالبات کا حسین امتزاج کسی دوسری دنیا میں ہونے کا احساس دلا رہا تھا یہ مشاہدات ناچیز کے لیے ایک دم نئے تھے۔ چہار جانب خوشگوار محفلیں اور ان محفلوں میں اردو داں طبقہ کی معیت انگڑائی لیتے خوابوں کو مزید مہمیز کررہی تھی۔ اردو داں طبقہ اس لیے کیونکہ حلقۂ احباب ابھی ہم جماعتوں تک ہی محدود تھا۔ مگر یہ سلسلہ ہم جماعتوں سے تجاوز کرتے ہوئے شعبہ کے دیگر طلبہ اور ان سے تجاوز کرتے ہوئے دیگر شعبوں کے رفقا تک پہنچ گیا۔

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی خوابوں کی تکمیل کا ایک نہایت مناسب پلیٹ فارم ہے یہاں کھلی آنکھوں سے دیکھے خوابوں کو گمان کی مانند لامتناہی اور غیر محدود فضا میں پرواز کرنے کی پوری آزادی ہے۔ دل میں روشن مستقبل کی ہزار ہا شمعیں روشن کیے خیالات کی پُرفریب وادیوں میں سیر کرتا ہوا زبان وادب میں کچھ کر گزرنے کے جذبہ سے سرشار صبح جلدی تیار ہوکر اپنے مشفق نگراں کے کمرہ میں حاضر ہوتا۔ اردو ادب اور بالخصوص موضوع سے متعلق تبادلۂ خیال کرکے بھرپور استفادہ کرتا اور اس کے بعد مولانا آزاد لائبریری کے اردو سیکشن میں شام ۵ بجے تک کتب بینی میں مبتلا رہ کر اپنی معلومات میں اضافہ کرتا۔ ناچیز نے اس علمی مشغلہ کو اپنے شبانہ روز معمول کا حصہ بنالیا جو پورے التزام کے ساتھ تاہنوز جاری ہے۔ ادھر کورس ورک کی کلاسیں بھی شروع ہوچکی تھیں جن میں پروفیسر سید محمد ہاشم صاحب و پروفیسر ظفر احمد صدیقی صاحب تحقیق کے اغراض ومقاصد، طریق کار اور تحقیقی مقالے کی ترتیب سے متعلق بیش بہا نکات سے روشناس کرکے علم وآگہی عطا کرتے تو موضوع (شاعری) سے متعلق کلاسوں میں معاصر تنقید نگاری کے دو عظیم نقاد پروفیسر ابوالکلام قاسمی صاحب و پروفیسر قاضی جمال حسین صاحب تنقیدی مباحث پر سیر حاصل گفتگو فرماتے اور تنقیدی شعور کو جلا بخشتے اور بالخصوص قاسمی صاحب روایتی شاعری وتنقید سے گریز کی ترغیب کرتے ہوئے اطہر نفیس کا یہ شعر اکثر سناتے:

اطہر تم نے عشق کیا کچھ تم بھی کہو کیا حال ہوا
کوئی نیا احساس ملا یا سب جیسا احوال ہوا

یہ وہ تربیت ہے جو طلبہ کو اردو زبان وادب کے بحر بیکراں میں غوطہ زن ہونے پر مجبور کرتی ہے۔ اس طرح کی ذہنی تربیت سے پہلے پہل آشنا ہورہا تھا تو حیرت ومسرت کی ہم آہنگ کیفیت سے دوچار ہونا لازمی تھا۔ شعبہ کے باہر کی دنیا بھی اردو کے لیے اجنبی نہیں تھی کیونکہ گریجویشن میں داخلہ لینے والے طلبہ کو اردو مضمون بحیثیت لازمی مضمون (A,B) Elementry یا NMT کی شکل میں پڑھنا ضروری ہے، اسے آرٹس فیکلٹی کے موجودہ ڈین پروفیسر محمد زاہد صاحب کی مساعیٔ جمیلہ کا نتیجہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ انھوں نے شعبہ اردو کی صدارت کے دوران خاصی جدوجہد کے بعد اضافی مضمون کے بجائے ان مضامین کی فہرست میں شامل کروایا جو امتحان کے نتائج میں فیصد (Percentage) میں نمایاں کردار ادا کرتے ہیں، اس سے ایک بڑا فائدہ یہ ہوا کہ طلبہ خواہ کسی بھی مضمون سے گریجویشن کررہے ہوں اردو زبان کو نہ صرف اس کی لطافت ونزاکت بلکہ اس نیت سے بھی دلچسپی سے پڑھتے ہیں کہ اس میں حاصل شدہ نمبر مجموعی نمبروں میں شمار ہوتے ہیں اور Percentage کو متاثر کرتے ہیں۔

یہاں اردو زبان محض شعبہ اردو تک محدود نہیں ہے بلکہ دیگر شعبہ جات سے لے کر تمام دفاتر میں کلرک سے لے کر اعلیٰ افسروں تک ہر شخص سلیس ورواں اردو بولنے پر عبور رکھتا ہے۔ علی گڑھ کا اختصاص یہ بھی ہے کہ اردو، شعبہ اردو کے اساتذہ کی گود میں ہی نہیں پلی بڑھی بلکہ اسے پروان چڑھانے میں حسب حیثیت ہر کس و ناکس کا مساوی کردار ہے جس کی عمدہ جھلک کیمپس میں ہونے والے ہر چھوٹے بڑے فنکشن، مشاعرے اور کانفرنسوں میں دکھائی دیتی ہے۔ اس کا اندازہ کیمپس میں ہونے والے مشاعرے جن کی تاریخی روایت ہے، سے بخوبی لگایا جاسکتا ہے، جن کی نظامت کا ذمہ ڈاکٹر شارق عقیل صاحب کے سپرد رہتا ہے جو کہ یونیورسٹی میں بحیثیت معالج اپنی خدمات انجام دے رہے ہیں مگر موصوف کی اردو دانی قابل رشک ہے کسی بھی پروگرام میں ان کی موجودگی کامیابی کی ضمانت تصور کی جاتی ہے۔ کینڈی آڈیٹوریم کے مشاعروں یا دیگر پروگراموں میں شرکت کرنے والا ہر شاعر ومہمان جذباتی طور پر خود کو ایک نئی دنیا میں محسوس کرتا ہے۔ دراصل یہی وہ سطوت و رعب ہے جو علی گڑھ کی عظمت ورفعت کو بیاں کرتا ہے۔ اور ہاں مشاعرے سے یاد آیا کہ شعر پڑھتے وقت ہر شاعر کے لیے ٹوپی جزو لاینفک کی حیثیت رکھتی ہے۔ قصداً تو ممکن ہی نہیں سہواً بھی اگر کوئی شاعر مائک پر بغیر ٹوپی پہنچ گیا تو پورے ہال کی خاموشی ٹوپی ٹوپی ٹوپی! کی فلک شگاف گونج میں تبدیل ہوجاتی ہے اور شاعر کے لیے ٹوپی پہننا ناگزیر ہوجاتا ہے۔ اچھے شعر پر داد وتحسین کی شکل میں مکرر مکرر! کی آوازوں سے ہال گونج اٹھتا اور پست وغیر معیاری شعر پر شائستہ کمنٹس

بھی خوب پاس کیے جاتے ہیں۔ مگر اس خیال کو ملحوظ رکھتے ہوئے کہ یونیورسٹی کا وقار مجروح نہ ہونے پائے اور اگر کچھ نو وارد طلبہ جو یونیورسٹی کی تہذیب و روایت سے ناواقف ہوتے ہیں مذاقاً کوئی ناشائستہ جملے کستے بھی ہیں تو ناظم مشاعرہ کی دوربیں نظریں ماحول پراگندہ نہیں ہونے دیتیں اور شاعر کو یہ محسوس تک نہیں ہوتا کہ اس کے کلام کو ناپسند کیا گیا ہے۔ یہ شارق عقیل صاحب کی اعلیٰ ظرفی ہے کہ وہ بہت پہلے ہی محسوس کر لیتے ہیں کہ سامعین و ناظرین کا تقاضا کیا ہے اور اسی کے مطابق شاعر کو مائک پر کھڑا کردیتے ہیں۔ سامعین کا اعلیٰ مذاق ہر نئے شاعر کو اپنا معترف بنا دیتا ہے۔ مشاعروں کے علاوہ مختلف پروگراموں کی نوعیت بھی اس سے کچھ جدا نہیں ہوتی ہے، خواہ وہ سرسید ڈے کے فنکشن ہوں، جلسۂ تقسیم اسناد ہو، ہالوں کے سالانہ پروگرام ہوں، ادبی محفلیں ہوں، شعری نشستیں ہوں یا طلبا یونین کے انتخاب سے متعلق ریلیاں اور تقریریں ہوں۔ ان میں اردو زبان کی سلاست و لطافت اور فصاحت و بلاغت سے بھرپور استفادہ کیا جاتا ہے اور اپنے مافی الضمیر کی ترجمانی کے لیے اردو زبان کو ایک مضبوط و توانا آلہ کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے اور غیر ارادی طور پر شعرا کے کلام سے بروقت خوب استفادہ کیا جاتا کبھی اقبال کی فکر سے متاثر ہو کر ان کے فلسفیانہ کلام کو مرکزی حیثیت دی جاتی اور شاہین و مرد مومن کا عملی تصور پیش کیا جاتا۔

تو شاہیں ہے پرواز ہے کام تیرا
ترے سامنے آسماں اور بھی ہیں

تو کوئی اپنی بات کا آغاز اس شعر سے کرتا:

سبق پھر پڑھ صداقت کا، عدالت کا شجاعت کا
لیا جائے گا تجھ سے کام دنیا کی امامت کا

تو کسی کی تقریر اس شعر سے شروع ہوتی:

نہیں تیرا نشیمن قصر سلطانی کے گنبد پر
تو شاہیں ہے بسیرا کر پہاڑوں کی چٹانوں میں

طلبہ یونین کے انتخابات میں یونین ہال کی چھت سے امیدواروں کے ذریعہ دی جانے والی Final Speech بھی طلبہ میں جوش و خروش بھر کے انتخاب کے نتائج میں نمایاں کردار ادا کرتی ہے۔ ان انتخابی تقریروں میں اگر الفاظ کا میزان مرتب کیا جائے تو تقریباً ۷۰ فیصد الفاظ اردو زبان کے ہوتے ہیں۔

یہ بات پورے وثوق کے ساتھ کہی جاتی ہے اور اہل علم حضرات اسے خندہ پیشانی سے تسلیم بھی کرتے ہیں کہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کا شعبۂ اردو دنیا کے تمام اردو شعبوں سے کہیں زیادہ عظیم اور متحرک و فعال ہے اور یہ بات ایسے ہی نہیں تسلیم کی جاتی اس کے پس پشت کارفرما محرکات و عوامل عینی شاہد ہیں کہ جو اسباب و علل کسی شعبہ کی عظمت و بلندی کے ضامن ہوتے ہیں وہ علی گڑھ کے

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے مختلف شعبوں سے شائع ہونے والے اردو جرائد

تہذیب الاخلاق	:	سرسید احمد خاں نے ۱۸۷۰ء میں شروع کیا۔ ادارۂ ''تہذیب الاخلاق'' کے زیر اہتمام تا حال جاری
فکر و نظر	:	علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ اردو کا ادبی رسالہ
علی گیرین	:	علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی طلباء یونین کی میگزین
اُردو جرنل	:	جنرل آرٹ فیکلٹی کا رسالہ
مسلم یونیورسٹی گزٹ	:	پندرہ روزہ ماہنامہ
سرسید رویو	:	بزم سرسید، سرسید ہال شمالی کا سالانہ مجلہ
سرسید	:	سرسید ہال جنوب کے طلباء کی سالانہ میگزین
آفتاب	:	آفتاب ہال کے طلباء کی سالانہ میگزین
محسن	:	محسن الملک ہال علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کا سالانہ مجلہ
وقار	:	وقار الملک ہال، کا سالانہ علمی و ادبی اور ثقافتی مجلہ
الحبیب	:	حبیب ہال، کا سالانہ علمی و ادبی اور ثقافتی مجلہ
مسعود	:	مسعود سَر راس ہال علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کا سالانہ مجلہ
ہادی	:	ہادی حسن ہال علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کا سالانہ علمی و ادبی مجلہ
ضیاء	:	سَر ضیاء الدین ہال، کا سالانہ علمی و ادبی اور ثقافتی مجلہ
سلیمان	:	سر شاہ سلیمان ہال کی میگزین

اس کے علاوہ دیگر ہالوں سے بھی میگزین اور مجلّات کی اشاعت ہوتی ہے۔ مثلاً علامہ اقبال کی میگزین ''علامہ'' عبداللہ ہال میگزین، اندرا گاندھی ہال میگزین، سروجنی نائڈو ہال میگزین، سلطان جہاں ہال میگزین، ندیم ترین ہال میگزین، رفتار، تحقیقات اسلامی، صدائے تعلیم، بزم ادب، علم و ادب، دانش، ندائے اعتدال، سحر آزاد وغیرہ۔ مزید برآں مختلف کالجوں، شعبوں اور فیکلٹیوں سے بھی سالانہ مجلّات کی اشاعت ہوتی ہے۔ طلباء کی جانب سے شائع کیے جانے والے یہ سالنامے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی بیش بہا روایات کا اٹوٹ حصّہ ہیں۔ المختصر یہ کہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں بنگال کا گدازِ فکر، پنجاب کی توانائی، کشمیر کی صباحت، دکن کی محفلوں کا حُسن، دلّی کا شکوہ اور لکھنؤ کی عطر آگیں تہذیب سب اپنا اپنا حق ادا کرتے ہیں۔ علی گڑھ اور اُردو کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ ایم۔اے۔او کالج کے قیام سے علم و عرفان کا یہ مرکز اُردو کی نشوونما و ترقی کے ساتھ خصوصی ربط رکھتا ہے۔ جدید اُردو نثر کی بنیاد علی گڑھ تحریک کے بانی اور ان کے رفقاء کے ہاتھوں پڑی، اور جدید نظم کو جولانی اور تگ و تاز کے وسیع میدان علی گڑھ تحریک ہی کے فیضان سے میسّر آئے۔ سرسید اور محسن الملک کی مقالہ نگاری، حالی کی طرز جدید پر نظم گوئی اور سوانحی و تنقیدی خدمات، شبلی کا ذوقِ تحقیق و تاریخ، نذیر احمد کی خطابت، جدید اُردو کے یہ آب و رنگ علی گڑھ کے فیضان کا پرتو ہیں۔

شمشاد بی

(ریسرچ اسکالر، شعبۂ اردو، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی)

شعبۂ اردو میں نسبتاً بدرجہ اتم موجود ہیں۔ خواہ وہ شعبہ کی تعلیمی سرگرمیاں ہوں، اساتذہ کی علمی و ادبی کاوشیں ہوں یا طلبہ کی کارگزاریاں، گویا ہر میدان میں شعبہ اردو کا اعلیٰ معیار پوری آب و تاب کے ساتھ اپنے فرائض انجام دے رہا ہے۔

اساتذہ کا امتیازی کردار یا ان کی عظمتوں کے نقوش یوں ہی ذہنوں پر ثبت نہیں ہوجاتے ہیں بلکہ اس کے پس پشت ان کی اعلیٰ صلاحیتوں اور زبان و ادب کو نئے تجربات و مشاہدات سے ہمکنار کرنے کے جذبہ کی کارفرمائی وسیع پیمانے پر نظر آتی ہے، اسی لیے اردو کی ہر صنف کے ماہرین ہمیشہ شعبہ کو زینت بخشتے رہے ہیں۔ مثلاً شعبۂ تحقیق وتدوین میں پروفیسر ظفر احمد صدیقی، پروفیسر سید محمد ہاشم، پروفیسر قمر الہدیٰ فریدی اور پروفیسر شہاب الدین ثاقب بدطولیٰ رکھتے ہیں تو وہیں دوسری جانب تنقید نگاری میں عالمی شہرت یافتہ نقاد پروفیسر ابوالکلام قاسمی، پروفیسر قاضی افضال حسین، پروفیسر قاضی جمال حسین، پروفیسر عقیل احمد صدیقی اور پروفیسر مولا بخش طلبہ کو راست تنقیدی بصیرتوں سے روشناس ہونے کے عظیم مواقع فراہم کرتے ہیں۔ فکشن نگاری میں پروفیسر طارق چھتاری اور پروفیسر صغیر افراہیم کی تحریریں عظیم فکشن کی شکل میں قبول خاص و عام کا درجہ رکھتی ہیں۔ وہیں شاعری میں پروفیسر سید سراج الدین اجملی، پروفیسر مہتاب حیدر نقوی، ڈاکٹر راشد انور راشد اور معید رشیدی وغیرہ شعرا کی بڑی جماعت موجود ہے جو وقتاً فوقتاً ملک و بیرون ملک میں ہندوستان کی نمائندگی کرتے رہتے ہیں۔ ان کی موجودگی سے طلبہ کو بھرپور مستفیض ہونے کا موقع ملتا ہے۔ پروفیسر محمد زاہد اور پروفیسر سید محمد امین اپنی مخصوص خطابت سے کسی بھی جلسہ کو رونق بخشنے پر مکمل عبور رکھتے ہیں خصوصاً پروفیسر زاہد کی اردو و فارسی کے اشعار پر مشتمل تقریر امتیازی حیثیت کی حامل ہوتی ہے۔ ان کے علاوہ دیگر تمام اساتذہ کسی نہ کسی فن میں مہارت تامہ رکھتے ہیں۔ مجموعی حیثیت سے یہ کہا جاسکتا ہے کہ اساتذہ کی اس نوع کی تعلیمی سرگرمیاں ادب میں نئے نئے امکانات کے دروازے تو کھولتی ہی ہیں ساتھ ہی طلبہ کی ذہنی صلاحیتوں میں نکھار پیدا کرنے کا فریضہ بھی بخوبی انجام دیتی ہیں۔

شعبۂ اردو میں ریسرچ اسکالرز کی تحقیقی، تنقیدی و تخلیقی صلاحیتوں میں نکھار پیدا کرنے کے لیے 'ریسرچ اسکالرز ایسوسی ایشن' کے زیر اہتمام ماہانہ ایک پروگرام منعقد کیا جاتا ہے، جس میں اساتذہ کی موجودگی میں ریسرچ اسکالرز اپنے مقالے، افسانے، کہانیاں اور غزلیں و نظموں کے علاوہ سوال و جواب کا سیشن بھی ہوتا ہے۔ کیمپس کے اندر اردو زبان و ادب کی راہیں ہموار کرنے میں CEC کی اعلیٰ کارکردگی سے انکار ممکن نہیں کیوں کہ CEC کے زیر اہتمام

علی گڑھ یونیورسٹی کے شعبہ اردو کے علاوہ دوسرے شعبوں سے وابستہ شخصیات کے نام جو ساری زندگی اردو کے فروغ کے لئے فعال رہے ہیں۔ یہاں پر ان میں سے چند شخصیات کے نام:

ڈاکٹر ذاکر حسین	معاشیات
ڈاکٹر عبدالستار صدیقی	فارسی اور لسانیات
ڈاکٹر عابد حسین	فلسفہ
اقبال سہیل	قانون
خواجہ منظور حسین	انگریزی
ڈاکٹر ہادی حسن	فارسی
پروفیسر بابر مرزا	زولوجی
یوسف حسین خاں	تاریخ
حبیب الرحمن خاں	دینیات
ڈاکٹر رشید جہاں	گائنکولوجی
ڈاکٹر عبدالعلیم	وائس چانسلر
مجنوں گورکھپوری	انگریزی
ڈاکٹر شان محمد	سیاسیات
ڈاکٹر محمد ہاشم قدوائی	سیاسیات
پروفیسر محمد یسین	انگریزی
اسلوب احمد انصاری	انگریزی
پروفیسر حکیم ظل الرحمن	حکمت

ڈاکٹر عبدالباری	عربی
مختار مسعود	اقتصادیات
ڈاکٹر کبیر احمد جائسی	علوم اسلامیہ
ڈاکٹر اطہر صدیقی	زولوجی
پروفیسر نذیر احمد	فارسی
مختار الدین آرزو	عربی
پروفیسر انور انصاری	نفسیات
پروفیسر نسیم انصاری	میڈیسن
ڈاکٹر ضیاء الدین انصاری	لائبریرین
فرخ جلالی:	تاریخ
پروفیسر ساجدہ زیدی	انگریزی
پروفیسر زاہدہ زیدی	انگریزی
ڈاکٹر نجمہ محمود	انگریزی
پروفیسر امین اشرف	انگریزی
پروفیسر شافع قدوائی	ماس کمیونیکیشن
پروفیسر افتخار عالم	میوزیولوجی

ان کے علاوہ اس ادارے سے وابستہ بے شمار ایسے نام ہیں جنھوں نے اپنی مصروفیات سے وقت نکال کر اردو میں اس قدر لکھا کہ اب ان کی شناخت کا بنیادی حوالہ اردو ہی ہے اور یہ روایت اب بھی قائم ہے۔ یہ خصوصیت علی گڑھ مسلم یونیورسٹی ہی کو حاصل ہے۔ اردو کے علاوہ دوسرے شعبوں کے اساتذہ اور طالب علم اردو کے فروغ میں متواتر کوشاں رہتے ہیں۔

شہناز رحمن (ریسرچ اسکالر، شعبۂ اردو، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی)

پورے سال کلچرل پروگرام منعقد کیے جاتے ہیں، جس میں یونیورسٹی ڈرامہ کلب کی ٹیم اپنی اعلیٰ صلاحیتوں کا مظاہرہ کرکے اداکاری کے عمدہ نمونے پیش کرتی ہے۔ اس بات کا تذکرہ یہاں اس لیے بھی ناگزیر ہے کیوں کہ بعض طلبہ جو پریم چندر، کرشن چندر اور منٹو وغیرہ کے افسانوں سے کسی قدر ناواقف ہوتے ہیں انھیں ان پروگراموں کے توسط سے بھی کسی حد تک آشنائی حاصل کرنے میں مدد ملتی ہے۔ کربل کتھا اسی نوعیت کا ایک اہم ڈراما ہے جس کے طویل اور اثر آفریں اردو مکالمے ناظرین پر رقت طاری کردیتے ہیں۔ راوی کے پر درد مکالمے بعض ناظرین کو رونے پر مجبور کردیتے ہیں۔ ڈراما کے اختتام پر جب کرداروں کو ان کے اصلی ناموں سے متعارف کرایا جاتا ہے تو ناظرین کی حیرت کی انتہا نہیں رہ جاتی کہ ڈراما کا راوی جسے مرکزی حیثیت حاصل ہے، انکت ملک نامی غیر مسلم طالب علم ہے۔ اس کی زبان کی سلاست و روانی سے ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے کوئی ماہرِ زبان ابوالکلام آزاد کی نثر کی قرأت کررہا ہو۔ اس کے علاوہ یونیورسٹی کے تمام ہالوں میں منعقد ہونے والے سالانہ ہال اور ہاسٹل فنکشنوں کے نام اور مجلّات اردو کی حیات ابدی کا قصیدہ پڑھتے نظر آتے ہیں ۔تریاق، آفتاب ادراک، شاہین اور ضیا وغیرہ ناموں سے موسوم کیا جاتا ہے۔ اور ان ناموں کا انتخاب عموماً طلبہ برادری کی جانب سے کیا جاتا ہے جو اس بات کا بین ثبوت ہے کہ یونیورسٹی کا ہر فرد جذباتی سطح پر اردو زبان وادب سے خود کو قریب محسوس کرتا ہے اور اس کے فروغ میں حسب حیثیت حصہ لیتا ہے۔

علی گڑھ آنے سے قبل جو باتیں تصورات کے حصار میں مقید رہتی تھیں علی گڑھ پہنچتے ہی ان باتوں اور علمی سرگرمیوں کو تجربات ومشاہدات کی کسوٹی پر کھرا ثابت ہوتا دیکھ کر یہ یقین مستحکم ہوتا چلا گیا کہ جب تک یہ ادارہ قائم ہے خواہ اردو کی زبوں حالی کی لاکھ دہائی دی جائے تاہم اردو کے وقار پر حرف نہیں آسکتا۔

پھونکوں سے یہ چراغ بجھایا نہ جائے گا

کیمپس کے باہر بھی اردو عام بول چال کا حصہ رہتی ہے۔ بعض کوتاہ نظر اپنی تنگ نظری کے باعث اے ایم یو میں ڈھابہ کلچر کو منفی نظریے سے دیکھتے ہوئے ڈھابوں کی نشستوں کو تضییع اوقات پر محمول کرتے ہیں جبکہ تصویر کا ایک رخ یہ بھی ہے کہ آج بھی چائے کے ڈھابوں پر ملک وقوم کے سلگتے مسائل پر تادیر تبادلۂ خیال کیا جاتا ہے اور سیاست سے لے کر ادب تک متعدد موضوعات پر گرما گرم بحثیں چائے کی چسکیوں کے ساتھ جاری رہتی ہے۔ اس بہتان کے بطلان کے لیے ایک واقعہ کا ذکر کافی ہوگا۔

آج سے تقریباً تین سال قبل شمشاد مارکیٹ میں احمدی اسکول برائے نابینیان کے پہلو میں واقع جیتو ڈھابہ پر پاکڑ کے ایک قدیم درخت کے ٹھنڈے سایہ میں اپنے رفقا عبدالرحمن فیصل، شہزاد انجم اور عبدالقوی وغیرہ کے ہمراہ جیتو کی کڑک اور خوشبودار چائے سے مشام جان کو معطر کررہا تھا۔ اتوار کا دن طلبہ کے لیے فرصت اور تفریح کا پیغام لے کر آتا ہے۔ وہ دن بھی اس سے کچھ جدا نہ تھا۔ چائے کی چسکیوں نے موضوعِ گفتگو کا رخ کب ادب کی طرف موڑ دیا معلوم ہی نہیں چلا۔

عبدالرحمن: یار اصناف کی حد بندی کافی حد تک شکوک شبہات کو دعوت دیتی ہے۔

عبدالقوی: اصناف ہی کا کیا تذکرہ ادب کی تمام تر تعریفات غیر واضح ہیں۔

شہزاد: ہاں بات تو ٹھیک ہے مگر ادب کے دوام اور اس کے مباحث میں یہی عدم وضاحت کلیدی کردار ادا کرتی ہے۔ سمینار میں اٹھنے والی بحثیں جس دن ختم ہوجائیں گی ادب کی ہمواری کے تمام راستے بھی اسی دن بند ہوجائیں گے ادب کی زندگی انھیں بحثوں میں پوشیدہ ہے۔

راقم: آپ کی باتوں سے اتفاق ہے مگر جہاں تک شعری اصناف کی شمار بندی کا سوال ہے تو اس میں کوئی تنازع یا اختلاف کی گنجائش نہیں ہونی چاہیے کیونکہ شعری اصناف کی تشکیل کا سادہ سا اصول یہ ہے کہ اس میں موضوع اور ہیئت کو یکساں اہمیت حاصل ہے۔ بعض اصناف مخصوص ہیئت کی بنا پر اپنی شناخت قائم کرتی ہیں تو بعض اپنے مخصوص موضوع کی بنیاد پر، وہیں بعض اصناف ایسی بھی ہیں جن کی شناخت میں موضوع اور ہیئت دونوں کا مساوی رول ہوتا ہے تو دوسری جانب بعض اصناف ایسی بھی ہیں جن کے برتنے میں داخلی نظام موضوعاتی سطح پر کسی خاص موضوع کا محتاج نہیں ہوتا ہے اور شعر کی ساخت کسی خاص ہیئتی پابندی کا التزام نہیں کرتی۔

عبدالرحمن: شعری اصناف تک تو غنیمت ہے مگر نثری اصناف متنازعہ فیہ ہیں۔ ان کا تعین نسبتاً مشکل ہے۔ ڈاک (ڈاکٹر) صاحب چائے لیں گے۔ اس درمیان جیتو کا چیلہ چائے کے گلاس تھامے سامنے حاضر تھا۔

عبدالقوی: ہاں کیوں نہیں، چائے نوشی سے ذہن کے تار مزید حرکت کرنے لگتے ہیں۔

اور اس طرح کسی تسلی بخش نتیجہ پر پہنچے بغیر گفتگو ختم ہوجاتی ہے۔ یہ سلسلہ یہیں منقطع نہیں ہوجاتا بلکہ نشست کی برخاستگی کے وقت باقاعدہ کسی دوسرے موضوع پر بحث کی دعوت بھی دی جاتی کہ آئندہ کس موضوع پر گفتگو ہوگی، اور پھر کسی روز کسی خاص موضوع مثلاً فکشن میں راوی کی اہمیت، بیانیہ کا بیان یا شعر میں ردیف وقافیہ کا التزام وغیرہ متعدد موضوعات زیر بحث آتے رہتے ہیں۔ حاصل گفتگو یہ کہ ڈھابوں کی نشستیں بھی ادبی نوعیت کی ہوتی ہیں جن میں مختلف اصناف کے ساتھ متعدد شخصیات پر سیر حاصل تبصرہ کیا جاتا ہے۔ ❑❑❑

یہ میرا چمن ہے میرا چمن
میں اپنے چمن کا بلبل ہوں

سفینہ بیگم
ناول 'خلش' کی اشاعت کے
علاوہ کئی افسانے بھی
مختلف جریدوں میں شائع
'ناول تنقید کے بنیادی مباحث کا
تنقیدی وتجزیاتی مطالعہ' کے موضوع
پر پی ایچ ڈی جاری، بنیادی طور پر
افسانہ نگار، وطن رام پور
محلہ ساہوکارا، تحصیل بلاسپور، رامپور
رابطہ: 8171986935

میں ویمنس کالج کے کیمپس میں داخل ہوئی تو ایک عجیب قسم کی گھبراہٹ نے مجھے آگھیرا۔ نیا ماحول نئے لوگ، پہلی دفعہ گھر سے اتنی دور، نہ کوئی رشتہ دار نہ دوست، جیسے میری ٹانگیں کانپنے لگیں۔ اچانک لڑکیوں کا ایک بڑا سا جھنڈ سامنے سے آتا ہوا نظر آیا اور میں سحر زدہ ہوگئی، مختلف قسم کے رنگین اور خوش نما لباس زیب تن کیے ہوئے بیگ ڈالے تقریباً بھاگنے کے انداز میں چلی آرہی تھیں کسی نے جینز کے ساتھ ٹی شرٹ پہن رکھی تھی تو کسی نے کرتا، کوئی شلوار قمیص میں تھی تو کوئی لانگ سکرٹ میں اپنے کھلے ریشمی بالوں کو لہرائے ہوئے چشمہ لگائے تیز تیز قدم بڑھا رہی تھی میں نے اپنے اوپر ایک نظر ڈالی برقعہ کے ساتھ اسٹال لگائے ہوئے میں نے خود کو ان سے بالکل الگ پایا لیکن کچھ ہی دیر بعد میرا یہ لباس مستثنیٰ نہیں رہا کیونکہ میں نے کالج کی سڑک پر اور پارک میں کالی الائچی کی مانند دور تک لڑکیوں کو بکھرے ہوئے دیکھا تو جیسے دل کو قرار آیا۔ کالج کا پہلا دن اپنی کلاس تلاش کرنے اور بھاگ دوڑ میں گزر گیا اسی درمیان میری ملاقات اپنی ان دوستو سے ہوئی جو مدرسے میں میرے ساتھ تعلیم حاصل کر رہی تھیں اور یہاں میرے ساتھ ہی انہوں نے داخلہ لیا تھا۔ میرے حواس ذرا بحال ہوئے تو میں نے بہت غور سے کالج اور اس کے باہر کے مناظر کا جائزہ لینا شروع کیا۔ کالج کے صدر دروازہ کے بالکل سامنے ان خواتین کی تصویریں آویزاں تھیں جو اپنی کلاس کی ٹاپر رہ چکی تھیں ان کی تصویروں میں موجود چہروں کے نقوش اور شفاف آنکھوں کی چمک سے ان کی ذہانت کا اندازہ لگایا جاسکتا تھا۔ کالج کے بالکل سامنے نہایت خوبصورت پارک تھا جس کے درمیان موجود درخت اپنی پوری آن بان کے ساتھ کھڑا تھا اس کی ہیئت کچھ اس نوعیت کی تھی جیسے وہ پاپا میاں اور بی اماں کی دیارِ غیر میں موجود ان بیٹیوں کو اپنی آغوش میں لینے کے لیے ہمہ وقت تیار ہو۔ دائرہ کی شکل میں بنا یہ پارک جس کے چاروں طرف خوبصورت اور رنگ برنگے پھولوں کی گھنی باڑھ تھی ماحول کو پر اثر اور دلکش بنا رہے تھے۔

وقت کا سورج آہستہ آہستہ ڈھلتا گیا اور میں یہاں کی تہذیب، ماحول اور اطوار وغیرہ سے واقف ہوتی گئی۔ ہر سال کالج میں علمی و ادبی پروگرام کا انعقاد کیا جاتا تھا جس میں ہر فیکلٹی کے طالب علم حصہ لیتے تھے خواہ ان کا تعلق سائنس سے ہو یا کامرس سے یا پھر آرٹس سے، ان پروگرام میں طلبہ جوش وخروش سے حصہ لیتے ہوئے نظر آتے۔

تخلیقی سطح پر ایک طرف سلوگن رائٹنگ اور creative writing کا مقابلہ ہوتا تو دوسری طرف بیت بازی کا مقابلہ ہوتا جس میں اردو مضمون پڑھنے والوں کے ساتھ ساتھ دوسرے مضامین مثلاً سائنس یا کامرس کی طالبات بھی دلچسپی سے حصہ لیتی تھیں۔اس مقابلہ کی ہر ٹیم زور وشور اور جذبے کے ساتھ جیتنے کی کوشش میں اقبال، غالب، فیض، فراق، فراز وغیرہ کے اشعار اچھے انداز میں پڑھتی تھی۔اسی درمیان میری ملاقات دو لڑکیوں سے ہوئی جن میں سے ایک کا اختصاصی مضمون ہندی تھا تو دوسری کا ایجوکیشن۔لیکن دونوں کو اردو ادب سے بے پناہ لگاؤ تھا میری ہندی والی دوست جس کا نام عرشیہ تھا وہ اکثر موقع پر فی البدیہ شعر پڑھتی تو شعر وشاعری میں اس کی اتنی دلچسپی دیکھ کر مجھے حیرت ہوتی۔

میری ایجوکیشن کی دوست جس کا نام عالیہ تھا وہ تو کئی نظموں اور غزلوں کی مصنفہ تھی ہاں اس کے اردو رسم الخط میں غلطیاں ہوتیں تو وہ ہندی رسم والخط میں اپنی شاعری کرتی اور اردو کے الفاظ کا در و بست بھی اسے خوب آتا تھا۔مجھے اس پر فخر محسوس ہوتا۔ایک دن ہم سب دوست ہاسٹل کے میدان میں بیٹھے شام کی چائے سے لطف اندوز ہو رہے تھے اور بیٹ منٹن بھی کھیل رہے تھے ہلکی ہلکی ہوا چل رہی تھی جو ہمارے چہروں کا بوسہ لے کر قریب سے گزر جاتی، دور ایک سست کتا لیٹا ہوا ہمیں بہت غور سے دیکھ رہا تھا۔ہوا نے ہماری شٹل کاک کو اپنا مرید بنا لیا تھا لیکن اس کے باوجود وہ ہماری دسترس میں تھی کہ اچانک میری دوست عرشیہ نے شعر پڑھا۔

اگر چہ زور ہواؤں نے ڈال رکھا ہے
مگر چراغ نے لو کو سنبھال رکھا ہے

اور اس پر میری دوسری ساتھیوں نے واہ واہی کا شور مچا دیا۔اس خوش گوار ماحول میں مغرب کی اذان ہونے لگی تو ہم سب رات کے کھانے کے بعد ملنے کا وعدہ کر کے اپنے اپنے کمروں کی طرف چلے گئے۔وقت کے کشادہ محل کے دربان نے گھنٹے کو زور سے بجایا تو مجھے احساس ہوا کہ دیارِ غیر میں موجود سارے پرندے جو ان کے لیے اب دیارِ غیر نہیں رہا تھا اپنی اگلی منزل کی تلاش میں نکل کھڑے ہوں گے۔نہ جانے اب کسی سے ملاقات ہو نہ ہو۔لیکن ایم۔اے میں داخلہ کے بعد پھر سے وہی تمام پرندے ایک ساتھ جمع ہو گئے۔

ایم۔اے میں داخلہ کے بعد یونیورسٹی کے main campus کو دیکھنے کا موقع ملا۔بابِ

سید جو کسی رحم دل بادشاہ کی مانند کئی دہائیوں سے ہر طلبہ کے سر پر دست شفقت رکھتا ہوا آ رہا تھا اسی شان سے موجود تھا۔بابِ سید میں داخل ہوتے ہی دل میں خوشی کی لہر اٹھی۔ہر طرف سائن بورڈ پر انگلش کے ساتھ اردو میں بھی اس جگہ کا نام لکھا ہوا تھا۔لڑکے اور لڑکیوں کا غول الگ الگ ٹکڑیوں کی شکل میں اپنے اپنے شعبوں کی جانب رواں دواں تھا جن میں زیادہ تعداد برقعہ والی لڑکیوں کی تھی۔لڑکوں نے شیروانی اور ٹوپی زیب تن کر رکھی تھی لیکن ان کے مقابلے میں پینٹ شرٹ والے لڑکوں کی تعداد زیادہ تھی۔

میں اور میری ایک دوست رکشا سے اترے تو قریب سے ایک شوخ لڑکا سر اور آنکھیں نیچے جھکائے السلام علیکم کہتا ہوا گزرا تو ہمارے چہروں پر بے ساختہ مسکراہٹ دوڑ گئی اور ہم نے اسے بھی یہاں کی تہذیب کے طور پر تسلیم کر لیا۔آرٹس فکلٹی کے باہر علامہ اقبال کی نظم ''طلبہ علی گڑھ کے نام'' ایک بینر پر لکھی ہوئی ٹنگی تھی جس کا یہ مصرعہ ''موت ہے عیشِ جاوداں، ذوقِ طلب اگر نہ ہو'' ہر طالب علم کے اندر نئی امید اور حوصلہ پیدا کرنے کے لیے کافی تھا۔اس نے میرے اندر بھی ایک نئی امنگ پیدا کر دی۔

ایم۔اے کی میری کئی سہیلیاں ایسی تھیں جو اردو سے ناواقف تھیں لیکن اردو سے ان کی دلچسپی غیر معمولی تھی وہ مشاعروں میں بھی شرکت کرتیں اور audio کی شکل میں شعر وشاعری سنتی تھیں کئی لڑکیاں تو ایسی تھی جو باقاعدہ اردو سیکھنے کے لیے شام کے وقت میرے کمرے پر بھی آیا کرتی تھیں اور ان کو پڑھاتے وقت مجھے خوشی کا احساس ہوتا تھا۔

ہر سال کی طرح اس سال بھی ہال ویک (hall week) کا اہتمام کیا گیا جس کا ایک مخصوص نام متعین کیا جاتا تھا۔ہال ویک میں مختلف قسم کے ادبی، علمی، ثقافتی مقابلوں کا انعقاد کیا جاتا اور اس کام کو انجام دینے کے لیے ایک کمیٹی تشکیل دی جاتی جو اپنی ذمہ داری اور نگرانی میں سارے کام کا معائنہ کرتی۔اس کمیٹی کی صدر کا تعلق شعبہ انگریزی سے تھا نائب صدر کا تعلق شعبہ سائنس سے اور سکریٹری کا تعلق شعبہ نفسیات سے۔

ان طالبات نے مل کر اس پروگرام کا نام ''افق'' منتخب کیا۔مجھے حیرت اس بات کی تھی کہ یہ تمام طالبات اردو سے نابلد تھیں اس کے باوجود اردو، لیکن

پھر معلوم ہوا کہ اردو لفظ کا انتخاب اس لیے کیا گیا ہے کیونکہ بقول ان کے:

''اردو ایک شیریں زبان ہے اور اس کو بولنے میں جو الگ طرح کا ذائقہ محسوس ہوتا ہے وہ کسی اور زبان میں نہیں۔''

ایک بار پھر مجھے خوشی کا احساس ہوا۔ اسی طرح دوسرے سال بھی ہال ویک کا title ''مضراب'' منتخب کیا گیا جس سے یہ صاف ظاہر تھا کہ غیر اردو داں طبقہ اردو سے کس قدر قریب ہے۔ جیسے ہی میں اپنی دوست عرشیہ کے کمرے میں داخل ہوئی اس نے شعر پڑھا۔

آپ آئے تو سہی رونقِ محفل بن کر
ہم نے ہر راہ ستاروں سے سجا رکھی ہے

اس نے مجھے بتایا کہ دوسرے ہال میں اس نے اور میری کئی ساتھیوں نے بیت بازی مقابلہ کے لیے اپنا نام دیا ہے اور ان کی جیت یقینی ہے کیونکہ وہ ہر شاعر کے کم از کم بیس بیس اشعار یاد کر کے جائیں گی۔

دن یوں ہی پر لگا کر اڑتے رہے اور اس درمیان میں نے لڑکوں کے کئی ہال کے بینر سڑکوں پر لگے ہوئے دیکھے جس کا ٹائٹل بھی اردو میں تھا اور open entry کے ساتھ نیچے ایک شعر لکھا ہوا تھا۔

تہذیب وثقافت کا ایک مرکز اے ایم یو کینٹین بھی

دوست کیمسٹری ڈپارٹمنٹ سے مجھے لینے لائبریری آتی پھر ہم ساتھ میں جوس پینے جایا کرتے۔ اکثر ہم سردیوں میں چائے کی ساتھ سموسوں کا مزہ لیتے اور گرمیوں میں جوس سے لطف اندوز ہوتے۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی اس کینٹین میں دوستی، محبت، شرافت، شرارت وغیرہ کا فسانہ بنانے کی دیرینہ روایت قائم ہے۔ جہاں ہم دل جمعی سے اپنے دوستوں کے ساتھ بیٹھ کے گپّے لگاتے اور گھنٹوں اٹھنے کا نام نہیں لیتے۔ کھانے سے زیادہ وہاں کا ہنگامہ خیز ماحول اپنی طرف کھینچتا۔ اس کینٹین میں اگر آپ ہنگامہ پسند ہیں تو اندرونی حصہ میں جا کر بیٹھ سکتے ہیں اور اگر آپ تنہائی پسند ہیں تو بیرونی حصے میں۔ کینٹین میں داخل ہوتے ہی باہر صاف ستھرا لان ہے جہاں چاروں طرف ہریالی ہی ہریالی ہے، بڑے بڑے تناور درخت اور خوبصورت پیڑ پودوں کی چھاؤں میں میز اور رنگ برنگی کرسیاں ہیں۔ جس دن یہاں جگہ مل جاتی اس دن درخت کی چھاؤں اور کھلی ہوا میں بیٹھ کر باتیں کرتے ہوئے لنچ کرنے کا مزہ ہی الگ ہوتا۔ مجھے یہاں جگہ کم ہی ملتی تھی چونکہ اس جگہ پر لڑکوں کا قبضہ ہوا کرتا جہاں وہ سگریٹ کے کش لگاتے ہوئے اندر آتے جاتے لڑکیوں کو دیکھتے ہوئے کمنٹ پاس کیا کرتے۔ ایسے میں اگر جگہ بھی ہوتی تو میری دوست ہاتھ کھینچ کر اندرونی حصے میں لے جایا کرتی بہت ہی دبّو قسم کی تھی لڑکوں کی صورت دیکھ کر ہی ڈر جایا کرتی تھی۔ مجھے کینٹین کے اندرونی حصے میں بیٹھنا زیادہ پسند نہیں تھا ایک تو وہاں اتنا شور ہوتا کہ کچھ سنائی نہ دیتا اور کینٹین کے کاؤنٹر سے مختلف قسم کی آواز سنائی دیتی۔ کوئی کہتا ''بھائی پیسے لے لیجئے، ایک پلیٹ راجمہ چاول کوئی کہتا بھائی ذرا جلدی کیجئے کب سے انتظار کر رہا ہوں چائے نہیں ملی اب تک، غرض کسی کو کولڈ ڈرنک کسی کو کڑھی چاول، کسی کو چھولے چاول کسی کو بریانی'' اور بھی نہ جانے کتنی طرح کے جملے سنائی دیتے۔ کوئی جگجیت سنگھ بنا پھر رہا تھا تو کوئی غلام علی اور کبھی کبھی کوئی عابدہ پروین بھی سنائی دے جاتی۔ مگر اس صورت میں بھی ایک چیز جو مجھے بہت پسند تھی، وہ اسٹیل کے برتنوں کا شور اور مختلف آوازیں مل کر ایک نوع کے صوتی آہنگ کا پیدا ہونا، جو میوزک کا مزہ دیتا تھا اور برتنوں کی یہی کھنک غزل کے لئے موسیقی کا کام کرتی۔ کبھی کبھی کوئی اس انداز سے گنگناتا اور لگتا کہ برتن اسی کی آواز پر تھرک رہے ہیں۔

ایک ساتھ اتنے لوگ کھانا کھا رہے ہوتے کہ اپنی تھالی کے بجائے دوسروں کی تھالی کو للچائی ہوئی نظروں سے دیکھا کرنا بھی کیا مزے کی بات تھی۔ دل میں افسوس ہوتا کاش ہم نے بھی یہی آرڈر کیا ہوتا۔ کھانا کھاتے ہوئے پورے دن کی روداد دوستوں کو سنائی جاتی۔ اپنے اپنے اساتذہ کے پڑھانے کے انداز کی نقل کی جاتی۔ اچھے برے ہر موضوع پر بے لاگ تبصرے۔ ٹیچرس کے عشق و عاشقی، مخطوطوں کا چربہ، اساتذہ کی کتابوں کے اقتباسات کی نقل سے لے کر کس نے کس کا مقالہ لکھا تک بحث ہی بحث اور پھر ساتھیوں کے معاشقے کی داستانیں۔ پتہ ہی نہیں چلتا اور وقت بیت جاتا۔ مختلف سبجیکٹ اور مختلف ماحول کے طلباء کی دل آویز سرگوشیاں اور دانشورانہ جملے اس کینٹین کی فضا میں رچے بسے تھے۔ اس کینٹین کے اطراف بکھری ہوئی مختلف تاریخی عمارتوں کے اندر ذہن سازی کی کاوشوں کے ساتھ ساتھ یہ کینٹین بھی طلباء کی تہذیبی وثقافتی تربیت کی زبردست آماجگاہ ہے۔ امیر نشاں سے لے کر اس کینٹین تک اٹھتے بیٹھتے، چلتے پھرتے طلباء ایک لامتناہی تہذیبی سلسلے سے دوچار ہونے کی خوش قسمتی شاید سب کے نصیبوں میں نہیں۔

نور فاطمہ

گلوں میں رنگ بھرے بادِ نوبہار چلے
چلے بھی آؤ کہ گلشن کا کاروبار چلے

وقت کے بادشاہ نے کروٹ لی تو سارے مناظر تبدیل ہو گئے۔ پورے کیمپس میں پیلے سوکھے پتے دور تک بکھرے پڑے تھے۔ رنگ برنگے نئے پرندوں نے اپنا ڈیرا جمانا شروع کر دیا تھا اب لڑکوں کے ساتھ زیادہ تعداد میں لڑکیاں بھی اسکوٹی استعمال کرنے لگی تھیں۔ مولانا آزاد لائبریری کی شان وشوکت کو دیکھ کر خود بہ خود کتابوں سے شغف پیدا ہونے لگتا اور قدم اپنے آپ اس کی جانب بڑھنے لگتے۔ یونیورسٹی کی یونین الیکشن کا زور اپنے عروج پر تھا۔ ہر طرف کاغذ اور نعروں کی بوچھار ہو رہی تھی۔ پمفلیٹ تقسیم کیے جا رہے تھے ہر کوئی اپنے پسندیدہ امیدوار کو جتانے کی کوشش میں لگا ہوا تھا میرے ہاسٹل میں بھی کیمپینگ کرنے والے لڑکوں کا تانتا بندھا ہوا تھا چونکہ مجھے اس طرح کی تقریریں سننے کا کبھی شوق نہیں رہا لیکن اپنی ساتھیوں کے ساتھ تفریحاً میں چلی آئی۔ آنے والا امیدوار کامرس ڈپارٹمنٹ سے تعلق رکھتا تھا۔ ایک دم کانوں میں اس شعر کی گونج سنائی دی۔

مؤرخ پھر نئی تاریخ کا پیغام لکھے گا
ہمیں عنواں بنائے گا ہمارا نام لکھے گا

''سرسید کے چمن کی شہزادیوں آپ

سب کو میرا اسلام'' کہہ کر اس نے اپنے ہاتھ کو پیشانی سے مس کرتے ہوئے اپنی تقریر کا آغاز کیا جس میں لڑکیوں کے مسائل اور ان کے حل کے لیے تجاویز پیش کرنے کے ساتھ ان کو یقینی بنانے کا وعدہ بھی کیا گیا ۔مجھے اکتاہٹ محسوس ہونے لگی تو اپنے کمرے پر چلی آئی اور اگلے دن کے سیمینار کی تیاری میں لگ گئی جو شعبہ انگریزی میں منعقد کیا جارہا تھا جس کا موضوع تھا

progressive writers

میں اور میری ساتھیوں نے مختلف فنکار پر اپنے پیپر تیار کیے اور حیرت اس بات کی تھی کہ اس سیمینار میں اکثر و بیشتر پرچہ اردو ادیبوں کی ادبی کاوشوں کے متعلق پڑھے گئے جن میں رشید جہاں، عصمت چغتائی قابل ذکر ہیں اور شعبہ انگریزی کے طلبہ نے ان پرچوں کو نہایت غور سے سنا اور سوالات بھی کیے، بلکہ اردو کے جو الفاظ سمجھ نہیں آئے ان کے معنی بھی دریافت کیے۔

سیمینار خوش اسلوبی کے ساتھ پروفیسر طارق چھتاری صاحب کی صدارتی تقریر کے بعد اختتام پذیر ہوا۔شب و روز کا یہ کارواں یوں ہی رواں دواں رہا کاتب تقدیر نے اپنے رجسٹر میں بہت کچھ لکھا اور مٹایا۔یونیورسٹی کے ترقیاتی کاموں میں اضافہ ہوا نئی سڑکیں وجود میں آئیں ،اسٹریٹ لائٹس لگادی گئیں ،درختوں کو مناسب شکلوں میں تراش دیا گیا۔دور تک جاتی ہوئی صاف و شفاف سڑک کسی حسین لڑکی کے چہرہ پر موجود بل کھاتی ہوئی لٹ کی مانند لگنے لگی۔ریسرچ کے کاموں میں تیزی آتی گئی اور ہر کوئی اپنی تھیسیس لکھنے میں مصروف نظر آنے لگا۔

میری ایک سینیئر شگفتہ آپا ایک دن ہاتھ میں جون ایلیا کا شعری مجموعہ ''گویا اور لیکن'' لیے ہوئے میرے کمرے پر کسی کام سے آئیں تو میں نے ان سے دریافت کیا کہ آپ یہ کیوں لیے گھوم رہی ہیں آپ کا موضوع تو ناول کے متعلق ہے تو انہوں نے مجھے بتایا کہ یہ ان کی دو دوست صبیحہ اور ندا جن کا تعلق شعبہ کیمسٹری اور شعبہ نفسیات سے ہے ان کو تحفہ میں دینے کے لیے لے کر جارہی ہیں۔

معلوم ہوا کہ جون ایلیا ان کے پسندیدہ شاعر ہیں اور انہوں نے فیس بک پر شاعری کا ایک page بھی بنا رکھا ہے۔بے ساختہ میرے منہ سے واہ کا کلمہ ادا ہوگیا اور مجھے یہ احساس ہوا کہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں اردو تہذیب و ثقافت کسی نہ کسی شکل میں قائم و دائم رہے گی۔خواہ زمانہ کی زرنگار طاقتیں اپنے چہرے کے کتنے ہی نقاب کیوں نہ بدلیں۔ان کے کشکول میں موجود کھنکھناتے ہوئے سکہ سازشوں کے کتنے ہی پیراہن کیوں نہ تبدیل کرلیں، یہ کارواں ہمیشہ کسی نہ کسی شکل میں چلتا رہے گا۔

❑❑❑

گابرئیل گارسیا مارکیز کے فن کے ساتھ عصری اردو افسانے پر مشمول اپریل ۲۰۱۸ء کا 'نیا دور'

بیسویں صدی کے محیر العقول تخلیق کار 'گارسیا گابرئیل مارکیز' کے شاہکار ناول 'تنہائی کے سو سال' کو شائع ہوئے پچاس برس پورے ہو گئے۔ اسی ناول پر انہیں ۱۹۸۲ء میں ادب کے نوبل انعام سے نوازا گیا۔اسپینش زبان میں مارکیز کو خدا کے بعد سب سے بڑا تخلیق کار تصور کیا جاتا ہے۔کہا جاتا ہے کہ بائبل کے بعد سب سے زیادہ انہیں کی کتابیں فروخت ہوتی ہیں۔'تنہائی کے سو سال' کے ۳۰ سے زیادہ زبانوں میں ترجمے ہو چکے ہیں۔

مشہور چیک ناول نگار 'میلان کندیرا' کا کہنا ہے جب 'تنہائی کے سو سال' کے جیسا ناول موجود ہے تو ناول کی موت کا اعلان کرنا محض لغویت ہوگا۔۱۹۷۰ء میں اس پر تبصرہ کرتے ہوئے 'ولیم کنیڈی' نے نیشنل آبزرور میں لکھا تھا کہ Book of Genesis کے بعد یہ پہلا ادبی شاہکار ہے جسے تمام نسل انسانی کو پڑھنا چاہئے۔

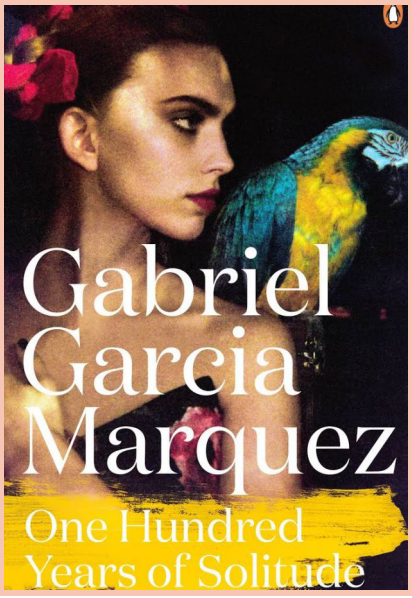

مارکیز کی چوتھی برسی پر انہیں بطور خراج اپریل ۲۰۱۸ء کے 'نیا دور' میں ان کے افسانوی فن پاروں پر دور حاضر کے معروف ادیب، نقاد اور محقق جناب **شمس الرحمن فاروقی** اور مغربی ادب کے رمز شناس، مشہور ناول نگار **خالد جاوید** کے علاوہ ہندی زبان کے ادیب **پربھات رنجن** کے مضامین بھی شامل ہوں گے۔اس کے علاوہ مارکیز کے شہرہ آفاق ناول 'تنہائی کے سو سال' کے اقتباسات کا ترجمہ بھی شائع کیا جائے گا۔اسی کے ساتھ **اقبال مجید، ف۔س۔ اعجاز ، مسرور جہاں، شموئیل احمد، رینو بہل، سلیم اختر، عبد الصبور قدوائی، تبسم فاطمہ، ارشد علی، محمد سلیم، گل جبین اختر** اور **رومی ملک** کے افسانے بھی شامل ہوں گے۔

دیگر لسانی اختلاط کے ساتھ
اردو زبان وادب کا نیا زاویۂ انفراد

نور فاطمہ
نقاد و محقق
'اقبال تنقید، مسائل و مباحث'
حالیہ کتاب کی اشاعت
مختلف ادبی جریدوں میں مضامین
کی اشاعت، فی الحال مولانا آزاد
یونیورسٹی کے لکھنؤ کیمپس میں اسسٹنٹ
پروفیسر کے عہدے پر فائز
وطن دیوبند

سی ۹، ایچ پارک، عقب نیرا ہاسپٹل،
مہانگر ایکسٹنشن، لکھنؤ
رابطہ: 7983395187

۱۳ اگست ۲۰۱۲ میری زندگی کا یادگار دن بن گیا۔ حیدرآباد آنا میرا پہلا تجربہ نہیں تھا۔ تقریباً تین ماہ قبل جب پہلی مرتبہ حیدرآباد کے لئے روانہ ہوئی تو پورے راستے ذہن میں طرح طرح کے وسوسے سر اٹھا رہے تھے۔ اس وقت یہ نہیں معلوم تھا کہ اس قدر باقاعدگی کے ساتھ مولانا ابوالکلام آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی سے اٹوٹ رشتہ جڑ جائے گا۔ اسی کشمکش کی کیفیت میں جب ٹرین اسٹیشن پر رکی اور پہلی مرتبہ میرے قدم نام پلی اسٹیشن پر پڑے۔ اس وقت رات کے تقریباً ۱۱ بجے ہونگے جہاں میرا استقبال خوشگوار اور روح کو فرحت بخشنے والی ہواؤں نے کیا۔

ایسا بالکل بھی محسوس نہیں ہوا کہ یہ شہر میرے لئے اجنبی ہے اور میں اپنے وطن سے کوسوں دور پردیس میں ہوں۔ حالانکہ یوپی کے مقابلے حیدرآباد کی زبان میرے لئے نامانوس تھی مگر یہاں کا مقامی لب ولہجہ بہت دلچسپ تھا۔ اسٹیشن سے گچی باؤلی یعنی یونیورسٹی تک پہنچنے کا مرحلہ کیسے طے ہوا پتہ ہی نہیں چلا۔ رات کی تاریکی اور سڑک پر جگمگاتی روشنی حیدرآباد کے حسن کو دوبالا کر رہی تھی۔ میں باہر کے نظارے بڑے اشتیاق کے ساتھ دیکھتی جا رہی تھی جو کسی فلم کے بدلتے ہوئے منظر کی طرح محسوس ہو رہے تھے۔ صاف ستھری چوڑی سڑکیں اور اطراف میں لگے پیڑ پودے، رات کے وقت اور دلکش لگ رہے تھے۔ جس بات سے میں زیادہ متاثر ہوئی وہ دکانوں اور اطراف میں لگے ہوئے اشتہارات تھے جو انگریزی کے ساتھ ساتھ اردو میں بھی لکھے ہوئے تھے

ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ میں کسی ایسے ملک میں پہنچ گئی ہوں جہاں اردو کی تہذیب وتمدن اپنی تمام تر جلوہ افروزیوں کے ساتھ رواں دواں ہے۔ اس شہر کی خوبصورتی کو دیکھ کر میں اپنی کیفیت کو بھول گئی۔ یونیورسٹی کے گیٹ کے اندر جیسے ہی گاڑی داخل ہوئی تو بے حد خوبصورت عمارت نظروں کے سامنے موجود تھی۔ گیٹ کے عین سامنے بے حد خوبصورت تراش خراش کے ساتھ جلی حرفوں میں MANUU لکھا ہوا ہے۔ ساخت وہیئت کے اعتبار سے یونیورسٹی کی عمارتیں اس طرز کی بنائی گئی ہے کہ وہ قدیم وجدید فن تعمیر کا حسین امتزاج کا نمونہ تھیں۔ یونیورسٹی کی ایک ایک چیز اردو تہذیب کی نمائندگی کرتی نظر آتی ہے۔ دل کو گونا گوں تسلی ہوئی کہ اگر تقرر ہو بھی گیا تو یہاں رہنے میں کوئی قباحت نہیں ہے۔ جس وقت میں نے یونیورسٹی کو جوائن کیا رمضان کا

بابرکت مہینہ شروع ہو گیا تھا۔ میں اپنے والد صاحب کے ساتھ یونیورسٹی کے نزدیک ایک ہاسٹل میں رہنے لگی۔ مگر وہاں ایک دو دن سے زیادہ دل نہیں لگا۔ کھانا بھی عجیب وغریب ملتا۔ ہم نے ہاسٹل چھوڑنے کا فیصلہ کرلیا اور اپنے ایک دور کے عزیز کے یہاں وقتی طور پر رہنے چلے گئے۔ یہ سلسلہ چند روز جاری رہا۔ شعبۂ اردو میں میرے سینئر ساتھی بڑی خوش مزاجی اور اپنائیت سے پیش آئے۔

ان میں سے کچھ لوگوں کو جب یہ معلوم ہوا کہ میرا وطن دیوبند ہے تو کچھ کی اس بات پر بھنویں بھی تنیں کہ دیوبند سے تعلق ہونے کے باوجود بھی میں پردہ کیوں نہیں کرتی ہوں۔ یونیورسٹی کا ماحول کچھ اس طرح کا تھا کہ وہاں کسی لڑکی کا بغیر حجاب ہونا عام طور پر نظر نہیں آتا تھا۔ جیسے جیسے لوگوں سے ملاقات ہوتی گئی ویسے ویسے اس بات کا احساس میرے اندر بڑھتا گیا کہ یہاں کی فضا میں کھلا پن تو ہے لیکن دینی حدود کی پابندی کے ساتھ۔ ماحول میں تعلیمی بیداری اور بے تکلفی کے باوجود ایک خاص قسم کی مذہبی حد بندی بھی ہے۔

دیوبند کا ہونا میرے لئے یوں تو باعث فخر ہے لیکن یہاں آکر دیوبند کے تعلق سے لوگوں کے ذہن میں میرے لئے جو تصور ابھرتا، اس سے کشید کئے ہوئے جملے سننے کی تو میں عادی ہوگئی تھی۔ ایک بات جو مجھے محسوس ہوئی وہ یہ کہ حیدرآباد میں بھی اردو کی تہذیب وتمدن کا عام طور پر ماحول پر مذہبی غلبہ زیادہ ہے۔ ظاہر ہے کہ مولانا ابوالکلام آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کا اس طرز فکر سے احتراز ممکن نہیں تھا۔

پوری یونیورسٹی میں چند خواتین ہی ایسی تھیں جن کی زندگی پر حیدرآباد اور مانو کی نیم مذہبی فضا اثر انداز نہیں ہو پائی تھی اور ان کا بیباک انداز باقی تھا۔

میرا ٹرانسفر جب لکھنؤ ہو گیا ایک صاحب نے تو مجھ سے یہ تک کہہ دیا کہ ہمیں افسوس ہے کہ اب بھی آپ یہاں سے بغیر برقع پہنے جارہی ہیں۔

ایک دن دوپہر کے وقت میں اپنے چیمبر میں بیٹھی ہوئی تھی کہ ایک اجنبی خاتون مجھ سے ملنے آئیں۔ بے حد محبت سے انہوں نے مجھے گلے لگاتے ہوئے کہا اگر رہنے کی کوئی پریشانی ہو تو بلا جھجک بتانا۔ دوسری طرف شعبہ کے لوگوں نے بھی اصرار کیا کہ آپ دونوں اکیلی ہیں۔ دونوں کا ساتھ میں مل جل کر رہنا بہت اچھا رہے گا۔ واقعی جتنے دن میں حیدرآباد میں رہی انہوں نے بڑی بہن کی طرح مجھے پیار کیا۔ آج بھی ان کے پُرخلوص محبت کے جذبے کو دیکھ کر آنکھیں نم ہو جاتی ہیں۔ میرے شعبے کے لوگوں کا رویہ میرے تئیں ہمیشہ بیحد پُرخلوص رہا جس کی یادیں لکھنؤ میں کئی سال گذارنے کے بعد بھی تازہ دم ہیں۔

جو ماحول میں نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں اپنے طالب علمی کے زمانے میں دیکھا وہ یادیں میرے وجود کا اٹوٹ حصہ ہیں۔ اپنے خیالات اور اپنی بات کو بے باک انداز لیکن سلیقہ مندی کے ساتھ بیان کرنے کا فن ہمارے اساتذہ نے ہمیں سکھایا تھا اور جی کھول کر ہماری حوصلہ افزائی کی تھی۔ کم وبیش اسی ماحول کی امید لے کر میں مولانا آزاد یونیورسٹی پہنچی۔

جنوبی ہندوستان میں اردو کی تہذیب وتمدن شمالی ہندوستان کے اردو کلچر سے بالکل مختلف ہے۔ محمد قلی قطب شاہ کی بارہ پیاروں کا موازنہ میر تقی میرؔ کے ۲۷ رنشتر سے بہرحال نہیں کیا جاسکتا۔ اسی طرح مخدوم محی الدین کے انقلابی مصرعوں کے ڈکشن کا نذیر اکبرآبادی کی شاعری کی لشکری ساخت سے موازنہ ممکن نہیں۔

ہر دس کوس پر بولی بدلنے والے ہندوستان میں جنوب اور شمال کے درمیان جتنا لمبا فاصلہ ہے، اتنا ہی دونوں کی تہذیب وتمدن میں فرق بھی نمایاں ہے۔ فنون لطیفہ، رقص وموسیقی اور زبان کے علاوہ کھانے کے ذائقے بھی مختلف ہیں۔ ایسے میں یہ امید کرنا کہ جو کچھ دہلی اور لکھنؤ کی فضا میں ہے وہ سب حیدرآباد میں بھی ہو، ایسا ممکن نہیں۔

مولانا آزاد یونیورسٹی میں شمالی ہندوستان سے تعلق رکھنے والے اساتذہ کی تعداد اچھی خاصی ہے۔ اس کے باوجود یہ فرق کرنا مشکل ہے کہ کون شمال کا ہے اور کون جنوب کا اور غالباً یہی اردو کا وہ کردار ہے جو اسے عالمی معیار عطا کرتا ہے۔

ایک اور واضح فرق یہ ہے کہ دہلی اور اس کے قرب وجوار کی یونیورسٹیوں میں ملک کے ہر خطّے سے طالب علم آتے ہیں لیکن یہاں حیدرآباد کے طلباء کی تعداد سب سے زیادہ ہے۔ اس کے بعد کیرل اور کشمیر کے طالب علم ہیں۔ اسی لئے مانو میں کلاس روم کے باہر کی زبان مقامی تیلگو کے وہ لفظ جو حیدرآباد دکن کے گلی کوچوں میں بولے جاتے ہیں، ان کے ساتھ اردو کی فصاحت اور بلاغت اکثر دیکھنے کو ملتی ہے۔ کچھ طلباء کے گروپ میں کشمیری کے ساتھ بھی تیلگو دکھتی ہے تو کہیں کہیں تیلگو بولنے والے انداز میں اردو بولتے ہوئے وہ طلباء بھی نظر آجاتے ہیں جن کی مادری زبان اردو نہیں ہے۔

اس پس منظر میں طلباء کی تعلیم وتربیت سے لے کر زبان درست کرانے یہاں تک کہ املا سے لے کر تلفظ تک کہ مراحل طے کرانے تک کی اضافی ذمہ داری بھی اساتذہ کے کاندھوں پر ہے۔ اسی وجہ سے یونیورسٹی سطح پر بھی اساتذہ کو مکتب والا انداز اپنانا پڑتا ہے۔ کلاس اور ڈپارٹمنٹ کے معاملات میں شمولیت کا معاملہ ہو یا ہاسٹل میں قیام پذیر لڑکے اور لڑکیوں کا معاملہ ہو، یا پھر دوستوں کے ساتھ کینٹین میں بیٹھ کر چائے پینے کے دوران ہلکی پھلکی گپ شپ اور علمی گفتگو کا معاملہ ہو، اس پورے ماحول کو دیکھتے ہوئے فصیح اردو بولنے کی امید تو ہرگز

نہیں کی جاسکتی۔ چونکہ اردو بولنے کے معاملے میں شمالی ہند کے مقابلے میں جنوبی ہند کے لوگ تذکیر و تانیث اور تلفظ کی غلطیاں اکثر کرتے ہیں۔ جس کا براہ راست اثر مانو پر بھی ہے۔ چونکہ اساتذہ اور طالب علموں کی کثیر تعداد حیدرآباد اور اس کے اردگرد کے صوبوں سے ہے۔

ابتدا میں کافی دنوں تک میں یونیورسٹی میں خاموشی سے حیدرآبادی اردو کا لطف لیتی رہی۔ ویسے بھی پوری یونیورسٹی پر حیدرآبادی زبان کے مقامی لہجہ کا زبردست غلبہ ہے۔ طالب علم کا تعلق ملک کے کسی بھی خطّے سے ہو لیکن ہاؤ (ہاں) نکو (نہیں) جیسے الفاظ کا کثرت سے استعمال کرنا سیکھ جاتے ہیں۔ میں بھی دو تین دن میں ہاؤ (ہاں) نکو (نہیں) سیکھ گئی تھی۔

یونیورسٹی تلنگانہ ریاست میں واقع ہے۔ ریاست تلنگانہ سے تعلق رکھنے والے طلبہ، تدریسی اور غیر تدریسی عملے کی کثیر تعداد یونیورسٹی میں موجود ہے۔ غالباً اسی سبب یونیورسٹی کا ہر طالب علم تلگو زبان کے لفظ چپو (بولو) انّا (بڑا بھائی) دمڑو (چھوٹا بھائی) جیسے الفاظ سے واقف ہوتا ہے۔ حیدرآبادی لہجہ دیگر زبانوں سے قدرے مختلف ہے۔ ق کا تلفظ (خ) میں بدل جاتا ہے اور اسی طرح لیب (لیاب) بیگ (بیاگ) میچ (میاچ) ادریچ، انوں ادریچ آرے (وہ ادھر ہی آرہے ہیں)۔ ویسیچ، کتنا بھی سمجھائے تم ویسیچ ہی رہتے۔ ایسیچ، کانکو ایسیچ بولتے۔ (کیوں ایسا بولتے ہو) تماں (تم) انوں (وہ) ناک میچ دم کر دیے (پریشان کر دینا) ابھی جا کے آتا (لوٹ کر آئے گا لیکن یہ نہیں معلوم کب تک) ذرّہ شرم کرو، (ذرا شرم کرو) ہلّو ہلّو بولو میاں (دھیرے دھیرے بولئے) خالی پلی (فالتو باتیں) بتاؤ (کسی بھی چیز کو دکھانے کے لئے بتاؤ لفظ کا استعمال کیا جاتا ہے) جیسے آئی کارڈ بتاؤ، ایسا کیسے ہوتا (ایسے نہیں ہوتا) بول کے بولو (بولو) اماں (مخاطب کرنے کے لئے بولتے ہیں)

مجھے یاد آیا حیدرآباد پہنچے ہوئے مجھے ایک یا دو روز ہوئے تھے میں نے یونیورسٹی جانے کے لئے آٹو والے سے پوچھا تو وہ بولا اماں اتنا پیسہ اچ لگتا۔ مجھے غصہ تو بہت آیا کہ کیا میں اس کو اماں نظر آرہی ہوں۔ مگر بعد میں معلوم ہوا کہ یہ لفظ تو مخاطب کرنے کے لئے یہاں کثرت کے ساتھ بولا جاتا ہے۔ یونیوسٹی میں لڑکیاں بھی مذکر کے صیغے میں بات کرتی ہیں مثلاً آؤں گا، جاؤں گا وغیرہ۔

مجھے مولانا آزاد یونیورسٹی میں اردو تہذیب کے نقوش تو بہت گہرے محسوس ہوئے مگر معیاری زبان کے معاملہ میں میرا اپنا الگ نظریہ ہے۔ حیدرآباد میں اپنے ڈیڑھ سال کے مختصر سے عرصے میں وہاں کی کینٹین، ہاسٹل اور لائبریری میں بھی اکثر و بیشتر جانا ہوتا تھا۔ بے ساختہ علی گڑھ کے ہاسٹل کی تصویر میری آنکھوں میں رقص کرنے لگتی اور میں اسی ماحول اور اسی تہذیب کو تلاش کرنے لگتی جو میرے رگ و پے میں بسی ہوئی ہے۔

میں جتنے دن حیدرآباد میں رہی خاص طور پر یوپی کے لڑکے اور لڑکیوں کو یہ شکایت کرتے ہوئے سنا کہ وہاں دونوں وقت کھانے میں چاول ملتے ہیں۔ بڑی کوششوں کے بعد شاید ہفتہ میں ایک دن روٹی ملتی تھی وہ بھی تبرک کی طرح۔ مگر جس دن حیدرآبادی بریانی کھانے میں ملتی اس دن تمام طلبا کے چہروں کی چمک قابل دید ہوتی۔ میں نے دیکھا کہ بنا کسی امتیاز کے لڑکوں کی طرح لڑکیوں کے ہاسٹل میں بھی کھیل کود کا بہترین انتظام ہے۔ مثلاً کرکٹ، بیڈمنٹن، چیس، کیرم وغیرہ، اس کے علاوہ مانو گرلس ہاسٹل میں ہر سال کلچرل اور مقابلہ جاتی پروگرام کرائے جاتے ہیں۔ اس نوع کے پروگرامس میں ہاسٹل کی لڑکیاں خوب بڑھ چڑھ کر حصّہ لیتی ہیں اور تقریباً ایک ہفتہ تک جشن کا ماحول رہتا ہے۔

گرلس اور بوائز ہاسٹل میں اردو کی تہذیب اور تربیت کی کمی شدت سے محسوس ہوتی ہے۔ اس کی وجہ صاف ہے کہ مانو جہاں واقع ہے وہ تیلگو کا علاقہ ہے اور ہر علاقہ کی اپنی علاقائی بولیاں اس کے جغرافیائی اسباب کی بنا پر فضا میں رچ بس جاتی ہیں۔

مجھے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے ہاسٹل میں رہنے کا طویل تجربہ ہے۔ وہاں کے ہاسٹل اور یہاں کے ہاسٹل میں زمین آسمان کا فرق محسوس ہوا کہ ایک ہی کمرے میں جب مختلف کلچر کے لوگ رہتے ہیں تو ہماری نئی تہذیب اور نئی زبان سے بھی آشنائی ہوتی ہے لیکن یہاں اس کا بھی فقدان نظر آیا۔ اتنا ہی نہیں اکثر طلباء سے بات کرنے پر محسوس ہوا کہ ہاسٹل میں پڑھائی کا ماحول اطمینان بخش نہیں ہے۔

ایک مرتبہ میں یونہی لڑکیوں کے ایک ہاسٹل میں گئی تو مجھے یہ دیکھ کر بڑی مایوسی ہوئی کہ کچھ لڑکیاں ہاسٹل کے آزاد ماحول کو کچھ زیادہ ہی آزادی کے ساتھ صرف کر رہی تھیں۔ میں نے دیکھا کہ زیادہ تر لڑکیاں WIFI,T.V اور موبائیل میں مصروف تھیں۔

میں نے ایک لڑکی سے پوچھا کہ کب پڑھتی ہو؟

اس نے بڑی ناگواری سے جواب دیا: کبھی بھی۔

میں نے پھر پوچھا کہ اچھا یہ بتاؤ کہ یہ ٹی وی اور موبائل میں کتنا وقت دیتی ہو؟ پلٹ کر اس نے کہا، کچھ طے نہیں۔

میں نے اس سے مزید گفتگو کرنے کی کوشش کی لیکن اس کی سرد مہری نے گفتگو کے اس سلسلہ کو یہیں ختم کر دیا۔

میں نے وہاں دیکھا کہ اکثر لڑکیاں فون پر اپنے اپنے علاقے کی زبان میں محو گفتگو تھیں۔ میں نے اپنے ڈیڑھ سالہ قیام کے دوران مانو میں اکثر یہ محسوس کیا کہ اردو درس و تدریس کے معاملہ میں مانو کا کوئی جواب نہیں ہے۔ جدید ٹکنالوجی سے آراستہ اس یونیورسٹی میں اردو کی تعلیم کا بہترین بندوبست

ہے اور وقت کی پابندی بھی زبردست ہے۔ صبح نو بجے تمام اساتذہ یونیورسٹی پہنچ جاتے ہیں اور یونیورسٹی میں صبح کا یہ منظر بڑا دلچسپ ہوتا ہے جب کالے برقعہ، کالی داڑھی، سفید کرتے اور پائجامے سمیت مختلف لباس میں طلباء و طالبات جوق در جوق نظر آتے ہیں۔

یونیورسٹی کی سید حامد لائبریری کا جواب نہیں۔ بیحد خوبصورت عمارت والی اس لائبریری کے اندر ہی ایک سیمینار ہال بنایا گیا ہے۔ اکثر سیمینار اسی ہال میں ہوتے ہیں۔ میں نے بھی یہاں ایک سیمینار میں شرکت کی تھی۔ سب کچھ نیا نیا سا ہے یہاں۔ ظاہر ہے کہ یونیورسٹی کے قیام کو ابھی بیس برس بھی نہیں ہوئے ہیں۔

دس بیس سال کسی بھی تعلیمی ادارے کی ترویج و ترقی کے لئے بہت کم ہوتے ہیں۔ یہاں اتنے کم عرصے میں اردو کی تعلیم و ترقی کے لئے جتنی تیزی سے کام ہو رہا ہے، اتنی تیزی سے کہیں اور نہیں لیکن صدیاں لگتی ہیں کسی تہذیب کی تکمیل کو۔

ایک مرتبہ لائبریری کسی کتاب کے سلسلے میں گئی تو بہت تلاش و جستجو کے بعد موضوع سے متعلق کتاب ملی۔ کتابوں کی بے ترتیبی کو دیکھ کر بڑی کوفت ہوئی۔ پڑھنے کا وہ ماحول بھی دیکھنے کو نہیں ملا جو کسی مرکزی لائبریری میں ہونا چاہئے۔ حالانکہ اچھی خاصی تعداد میں کتابیں موجود ہیں مگر کتابوں کی ترتیب کے معاملے میں لائبریری بدنظمی کا شکار ہے۔ ریک میں کتابوں کو موضوعات کے اعتبار سے نہیں رکھا گیا ہے۔ طلبہ جہاں سے کتاب پڑھنے کے لئے اٹھاتے ہیں واپس جگہ پر نہیں رکھتے جس کی وجہ سے کتابوں کی جگہ بدلتی رہتی ہے لیکن آہستہ آہستہ بد نظمی حسن ترتیب میں تبدیل ہو رہی ہے۔ دیگر یونیورسٹیوں کی لائبریری کی کتابوں کی لسٹ یا تو آن لائن ہے یا پھر لائبریری ہی میں طلبہ و طالبات کو کمپوٹر کی سہولیات دستیاب ہے۔ جس کے ذریعہ بچے تلاش کر کے اپنے ضرورت کی کتابیں آسانی سے نکال لیتے ہیں۔ دوسری یونیورسٹیوں کی طرح مانو کی لائبریری میں کیٹلاگ کی کمی کھٹکتی ہے۔ لائبریری میں سائنس، مطالعات نسواں، ماس میڈیا اور ترجمہ وغیرہ کی کتابوں کا ذخیرہ کم ہونے کی وجہ سے اکثر و بیشتر طلبہ و طالبات کو مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

لائبریری سے نکل کر میرا رخ یونیورسٹی کی جانب تھا۔ کسی یونیورسٹی کی کینٹین بھی تہذیب کا اہم حصہ ہوتی ہے۔ کینٹین پہنچنے پر ماحول میں ہنگامہ اور رنگارنگی کی کمی واضح طور پر محسوس ہوئی۔ ہر طرف سناٹا تھا۔ مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے میں ابھی بھی لائبریری میں ہی موجود ہوں۔ جو ہنگامہ خیز ماحول دیگر یونیورسٹیوں کی کینٹین میں ہوا کرتا ہے اس کے برعکس مانو کی کینٹین کے ماحول میں سرد مہری اور خاموشی کی حکمرانی تھی۔

حیدرآباد میں قیام کے دوران اکثر اپنی دوست کی ساتھ کینٹین جایا کرتی مگر کئی بار باہر ہی سے کینٹین کا دیدار کر کے واپس آنا پڑتا تھا۔ خوش قسمتی سے اگر کینٹین کھلی ہوئی ملتی تو اکا دکا لوگ خاموشی سے بیٹھے چائے پی رہے ہوتے۔ کینٹین کسی بھی یونیورسٹی کا ایسا مقام ہے جہاں پر مختلف کلاسز اور کورسز کے طلبا یکجا ہوتے ہیں اور اپنی دن بھر کی روداد مزے لے لے کر اپنے دوستوں کو سناتے ہیں۔ کبھی دل لگی کی باتیں ہوتی ہیں تو کبھی سیاست پر تبصرہ تو کبھی درس و تدریس کی باتیں یہاں تک کہ اپنے دوستوں کے درمیان اپنے اساتذہ کے پڑھانے کے طریقوں پر پھبتیاں کسنا جیسی باتیں بھی ان میں شامل ہوتی ہیں۔ اس طرح کی گفتگو سے کینٹین کا ماحول خوشنما ہو جاتا ہے اور بھانت بھانت کی بولیاں سنائی دیتی ہیں۔ عموماً دیگر یونیورسٹیوں کی کینٹین میں طالب علم ہر موضوع پر بے باک انداز میں اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہیں۔

ہندوستان کی دیگر یونیورسٹیوں کی طرح مانو میں بھی مختلف زبان کے بولنے والے طلبہ و طالبات تعلیم حاصل کرنے آتے ہیں۔ جس کے سبب کینٹین میں باہمی گفتگو کے دوران مختلف زبانوں کی آمیزش کا بہترین نمونہ دیکھنے کو ملتا۔ مجھے اس بات کا شدت سے خیال آتا کہ جس طرح طالب علمی کے زمانے میں اپنے ساتھیوں کے ساتھ ہر موضوع سے متعلق ہم گھنٹوں کینٹین میں بیٹھ کر تبادلۂ خیال کیا کرتے تھے اس بات کی لذت سے مانو میں تعلیم حاصل کر رہے طالب علم یکسر محروم ہیں۔

مولانا آزاد نیشنل اُردو یونیورسٹی کے مقاصد کو مدنظر رکھتے ہوئے اگر ہم اُردو زبان کے فروغ کی بات کریں تو تجربے اور مشاہدے سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ اُردو زبان کو رائج کرنے کی جتنی کوشش یونیورسٹی کی جانب سے ہو رہی ہے اس پر طلبہ و طالبات کھرے نہیں اتر پا رہے ہیں۔ اتنی کوششوں کے باوجود بھی اُردو زبان صرف کلاس روم کی زبان بن کر رہ گئی ہے۔ وہ اُردو زبان میں لکھنے پڑھنے کے اہل تو ہو جاتے ہیں۔ لیکن چونکہ اسّی فیصدی بچے ہندوستان کے دیگر شہروں سے تعلق رکھتے ہیں اس لیے یہ لوگ زیادہ تر اپنی علاقائی زبان کو ترجیح دیتے ہیں۔ جیسے حیدرآباد، اڑیسہ، کیرل وغیرہ کے طلبہ و طالبات ہی کو لے لیجئے چاہے ان کا تعلق کسی بھی کورس سے ہو وہ اپنی مخصوص علاقائی زبان کو ہی ترجیح دیتے ہیں۔

وہ اردو میں پڑھنا لکھنا تو سیکھ لیتے ہیں لیکن ایک اُردو یونیورسٹی میں پڑھنے والے طالب علم کی زبان میں جو فصاحت ہونی چاہیے وہ اس سے محروم رہ جاتے ہیں۔ اگر ملکی سطح پر اردو زبان و تہذیب کو فروغ دینا ہے تو درسی کتابوں کے ساتھ ساتھ روزمرہ کی زندگی اور عام بول چال میں اس زبان کو شامل کرنا ضروری ہے۔ تب ہی ہماری گفتگو کا سلیقہ دوسروں پر اپنی چھاپ چھوڑنے میں کامیاب ہو سکتا ہے۔

❑❑❑

اردو زبان کی تعلیم و تعلم کے ادبی امکان کی بازیافت

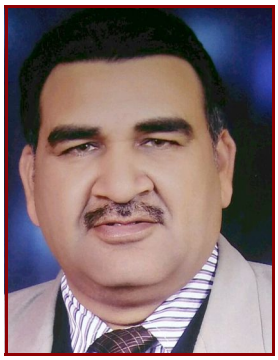

اسلم جمشید پوری

ادیب، نقاد اور محقق

۳۰ کتابوں کے مصنف

فی الحال چودھری چرن سنگھ یونیورسٹی،

میرٹھ میں صدر شعبۂ اردو

کے عہدے پر فائز

بنیادی طور پر افسانہ نگار

وطن بلند شہر

C-5، یونیورسٹی کیمپس،

چودھری چرن سنگھ یونیورسٹی، میرٹھ

رابطہ: 9456259850

موبائل کی گھنٹی، دوران کلاس بجی۔ مجھے ایسے اوقات بڑی جھنجھلاہٹ ہوتی تھی۔ میں کلاس شروع ہونے سے قبل ہی اعلان کر دیتا ہوں۔

'اپنے اپنے موبائل بند کر لیں۔'

اور احتیاطاً میں نے بھی اپنا موبائل بند تو نہیں لیکن Silent ضرور کر لیتا ہوں تاکہ ایمرجنسی کال کو معذرت کے ساتھ، اٹھا لوں لیکن آج جب میرا ہی موبائل بج اٹھا تو مجھے خود سے خفگی، شرمندگی اور جھنجھلاہٹ ہوئی۔ نہ جانے آج میں اسے Silent کرنا کیسے بھول گیا۔ مجبوراً اور طالب علموں سے معذرت کے ساتھ میں نے فون ریسیو کیا۔ پتہ چلا کہ نالندہ یونیورسٹی کے وائس چانسلر بات کرنا چاہتے ہیں۔ میں نے کہا، 'بات کرائیں' اور تھوڑی دیر میں پروفیسر اعجاز علی ارشد کی آواز سنائی دی۔

'اسلم صاحب، آپ کو وائیوا لینا ہے، وہی PhD کا، کب آ سکتے ہیں؟'

اس سے قبل کہ میں جواب دیتا، انہوں نے خود ہی کہہ دیا، '۲۶ مارچ کو آ جائیے۔ ٹھیک ہے...'

'جی.....سر.....!' میں نے احتراماً ان کا لحاظ کرتے ہوئے ہاں میں ہاں ملائی۔

میں نے فون بند کیا۔ طالب علم مجھے دیکھ رہے تھے۔ 'ہاں تو ہم کیا پڑھ رہے تھے؟'

اس طرح بات آئی گئی ہوگئی۔ اس دوران کئی بار اعجاز علی ارشد صاحب سے بات ہوئی۔ دوران گفتگو ہی پتہ چلا کہ نالندہ یونیورسٹی کے وائس چانسلر کا بھی اضافی چارج ان کے پاس ہے۔ ویسے وہ بنیادی طور پر مظہر الحق عربی فارسی یونیورسٹی، پٹنہ کے وائس چانسلر ہیں۔ گزشتہ دنوں ایک پی ایچ ڈی تھیسس، جو شاید مولانا ولی رحمانی کی شخصیت اور ادبی خدمات پر تھی، آئی تھی۔ میں نے وقت پر رپورٹ بھیج دی تھی۔ وائیوا کے دن جب میں پٹنہ پہنچا تو پتہ چلا کہ نالندہ یونیورسٹی کے وائس چانسلر کوئی اور ہو گئے ہیں اور وائیوا انہیں کے آفس میں ہے۔ مقالے کے نگراں بھی پروفیسر اعجاز علی ارشد تھے۔ اس لئے وہ بھی حاضر تھے۔ وائیوا کے بعد ہم لوگ اعجاز صاحب کے ہمراہ دوپہر کے لئے، سہ پہر میں کسی آرام دہ پرسکون ہوٹل کی تلاش میں نکلے۔ سبھی ہوٹلوں میں پاؤں رکھنے کی تو جگہ تھی لیکن سکون سے بیٹھنے کی نہیں۔ پھر طے ہوا کہ یونیورسٹی آفس چلتے ہیں۔ کھانا وہیں منگوا لیں گے اور ایسا ہی ہوا اور پڑھنے، پڑھانے یا گھومنے کے بجائے ہم مظہر الحق عربی فارسی یونیورسٹی

برائے طعام پہنچے۔ پٹنہ میں حج ہاؤس کے پاس ایک بڑی سی عمارت میں واقع یونیورسٹی کے مختلف شعبوں اور دفاتر سے گزرتے ہوئے شیخ الجامعہ پروفیسر اعجاز علی ارشد کے آفس میں داخل ہوئے۔ شیخ الجامعہ کا شاندار آفس، بہترین رکھ رکھاؤ اور سلیقے میں اردو تہذیب کی جھلک دیکھ کر مسرت آمیز حیرت ہورہی تھی۔ کھانے سے فراغت کے بعد میں نے اپنی حیرتوں اور تجسس کو ختم کرنے کا سامان کیا۔ یونیورسٹی کے متعلق مختلف لوگوں سے معلومات حاصل کرنے لگا۔ کچھ دفاتر اور شعبوں کا جائزہ بھی لیا۔ منظر اور پس منظر سے واقفیت کے بعد یونیورسٹی کی تصویر کچھ یوں واضح ہوئی۔

بہار اسٹیٹ یونیورسٹیز ایکٹ ۱۹۷۶ کی ترمیم شدہ شق ۱۹۹۲ کے مطابق مولانا مظہر الحق کے نام 'مولانا مظہر الحق عربی فارسی یونیورسٹی' کے نام سے ۱۹۹۸ء میں قیام عمل میں آیا۔ مولانا مظہر الحق ہندوستان کے معدودے چند نامور سیاستداں تھے جو بیک وقت ماہر قانون، ماہر تعلیم، مجاہد آزادی، شاعر، فلسفی اور سیاسی مدبر تھے۔ انہوں نے قانون کی اعلیٰ ڈگری انگلینڈ سے حاصل کی۔ وطن واپسی پر ملک کی آزادی کے حصول کے لئے گاندھی جی کے شانہ بشانہ تحریکات میں حصہ لیا۔ صداقت آشرم، پٹنہ آپ کی یادگار ہے، جہاں گاندھی جی اکثر تشریف لایا کرتے تھے۔ مولانا مظہر الحق کا شمار بہار کی انگلیوں پہ شمار کی جانے والی چند شخصیات میں ہوتا ہے۔ ان کے نام پر یونیورسٹی کا قیام انہیں سچا خراج ہے۔

یونیورسٹی کے قیام کے ساتھ پہلے شیخ الجامعہ کے طور پر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے معروف فارسی اسکالر پروفیسر مختار الدین احمد آرزو کا تقرر ہوا۔ انہوں نے بطور وائس چانسلر اپنا عہدہ سنبھالا مگر حکومت کی بے توجہی اور بعض غلط فہمیوں کی بنیاد پر یونیورسٹی کاغذ سے زمین پر نہیں آسکی اور تقریباً ۶ سال کے بعد حکومت کو پھر کسی مصلحت کی بنا پر یونیورسٹی مولانا مظہر الحق یاد آئے اور پروفیسر ایم مشرف عالم کا تقرر بحیثیت وائس چانسلر ۱۴ رمئی ۲۰۰۴ء کو عمل میں آیا۔ اپنے ضابطے کے مطابق یونیورسٹی کا دائرہ پورا بہار تھا۔ قیام کے وقت ہی یہ منصوبہ تھا کہ عربی، فارسی کے مدارس کو یونیورسٹی سے الحاق کیا جائے گا اور ریاست میں مدارس کے فروغ کے ساتھ ساتھ اردو زبان و ادب کی اعلیٰ تعلیم کے ساتھ دیگر اہم کورسیز کے توسط سے یقینی بنایا جائے گا۔ کوششیں شروع ہوئیں، زمین تیار ہونے لگی، مدارس اور اس سے منسلک افراد میں ایک امید کی کرن جاگی، کچھ کام آگے بڑھا۔ وقت معینہ پر وائس چانسلر آتے اور جاتے رہے۔ یونیورسٹی کو عارضی طور پر علی امام پتھ (ہارڈنگ روڈ) پر نئی تعمیر شدہ عالیشان عمارت 'عبد القیوم انصاری بھون' الاٹ کی گئی۔

ایک خواب، آہستہ آہستہ اپنی تعبیر کو شرمندہ کررہا تھا۔ یونیورسٹی کے دفاتر، شعبے، نئے نئے کورسیز، نئے نئے مراکز کا سلسلہ شروع ہوا۔ یونیورسٹی نے کام کرنا شروع کردیا۔ سب سے بڑے کام کے طور پر یونیورسٹی نے بہار کے مدارس کے عالم (BA) اور فاضل (MA) کے امتحانات کرانے شروع کئے۔ یہی نہیں، مدارس کو عصری تعلیم سے آراستہ کرنے کے لئے متعدد پروفیشنل کورسیز کا آغاز ہوا۔ مثلاً MBA, BCA وغیرہ لائبریری سائنس میں ایک سالہ ڈگری کورس شروع کیا جس کی اہلیت گریجویٹ ۴۵ فیصد نمبروں کے ساتھ رکھی گئی۔ ایک سالہ مختلف ڈپلوما کورسیز فنکشنل عربی، فنکشنل فارسی، مخطوطہ شناسی اور اکاؤنٹ اور لائبریری سے متعلق کورسیز شروع ہوئے۔ یہی نہیں ٹیلی کام اینڈ موبائل ٹیکنالوجی، کمپیوٹر ہارڈویئر، الکٹرانک وائرنگ، اسلامک بینکنگ اور فنکشنل عربی میں ایک سال، نو مہینے اور چھ مہینوں کے سرٹیفکٹ کورسیز شروع ہوئے۔ یہ سب کورسیز Knowledge Resource Centre کے طور پر شروع ہوئے۔

ان تمام کورسیز میں مدارس کے طلبہ کے لئے داخلے یقینی بنائے گئے۔ یونیورسٹی نے ان کورسیز کے آغاز اور فاضل اور عالم کے امتحانات کے انعقاد سے اپنی الگ شناخت قائم کی۔ وہ طالب علم جن کے داخلے ہائی فائی اور بہت زیادہ فیس والے پروفیشنل کورسیز چلانے والے اداروں میں نہیں ہو پاتے تھے، ان کے لئے بڑی راحت کی بات ہوئی۔ یہی سبب ہے کہ جہاں ابتدائی برسوں میں چند طالب علم تھے وہیں طلبہ کی تعداد میں خاطر خواہ اضافہ ہوا اور ہزاروں طلبہ و طالبات کے داخلے ہوئے۔

مولانا مظہر الحق یونیورسٹی ۲۰۱۲ء اور اس کے بعد آہستہ آہستہ یونیورسٹی کی شکل وصورت اختیار کرنے لگی۔ یونیورسٹی نے ایک اور بڑا اقدام کیا۔ B.Ed کا نہ صرف کیمپس میں کورس شروع ہوا بلکہ متعدد پرائیوٹ اداروں کو B.Ed کی منظوری دی گئی اور دیکھتے دیکھتے پوری ریاست میں تقریباً ۳۰ بی ایڈ کالجوں کا الحاق یونیورسٹی سے ہوا۔ ان کالجوں میں مدارس کے فارغین کو بھی داخلے کے مواقع فراہم کئے گئے۔ اس اقدام سے یونیورسٹی کی شہرت میں مزید اضافہ ہوا۔

یونیورسٹی کے فروغ کا تیسرا مرحلہ پوسٹ گریجویشن کے مختلف شعبوں کی شروعات تھی۔ ابتدائی طور پر اردو، انگریزی، فارسی، عربی، جرنلزم، ایجوکیشن، اسلامک اسٹڈیز اور مینجمنٹ میں PG کے شعبے قائم ہوئے اور ایم اے کے کورسیز کا آغاز ہوا۔ ان شعبوں اور کورسیز کے آغاز سے یونیورسٹی کے قد میں اضافہ ہوا۔ پڑھنے پڑھانے کا ماحول بنا اور پھر یونیورسٹی اپنے مقاصد کی طرف

تیزی سے گامزن ہوئی۔

ان تمام اقدامات کے باوجود ابھی کئی اور کام ایسے تھے جن کے بغیر یونیورسٹی کا تصور خام خام ہی لگتا ہے۔ پروفیسر اعجاز علی ارشد کے وائس چانسلر بننے کے بعد ایک اہم کام یہ ہوا کہ حکومت نے اپنے دیرینہ وعدے پر عمل کرتے ہوئے شہر کے قلب میں ۵ ایکڑ سے زائد زمین الاٹ کی۔ یہ ایک بڑی کامیابی تھی۔ زمین تو اس سے قبل بھی الاٹ ہو چکی تھی لیکن بعض شر پسند عناصر کی مخالفت نے اس کی بیل کو منڈھے نہیں چڑھنے دیا۔ کفر ٹوٹا خدا خدا کر کے۔ زمین ملی اور زمین کی حد بندی یعنی چہار دیواری کا کام شروع ہوا اور دیگر تعمیرات کیلئے حکومت سے فنڈ جاری ہوئے۔

یونیورسٹی کیلئے ضروری اجزاء میں طالب علم، عمارت کے ساتھ ساتھ تدریسی اور غیر تدریسی عملے کی تقرری کا اہم کردار ہوتا ہے۔ غیر تدریسی عملے کا تقرر (مستقل) عمل میں آیا۔ اساتذہ کی بحالی عارضی اور مستقل دونوں طرح سے ہوئی۔ کئی شعبوں میں چار لکچرر، دو ریڈر اور ایک پروفیسر کی تقرری ہوئیں۔ کچھ میں مستقل تقرری ہوگئی اور کچھ شعبوں میں ابھی عارضی تقرری سے کام چلایا جارہا ہے۔ گزشتہ برس تک یونیورسٹی کے مختلف کورسیز میں کل ملا کر تقریباً بائیس ہزار طلبہ وطالبات تھے۔

یونیورسٹی کا پہلا کنووکیشنل پروگرام ۲۲ر دسمبر ۲۰۱۰ء کو منعقد ہوا۔ مختلف کورسیز کی ڈگریاں تقسیم ہوئیں۔ یونیورسٹی ابھی اپنے تشکیلی دور سے گزر رہی ہے۔ مختلف کورسیز کامیابی سے اپنا سفر پورا کر رہے ہیں۔ بہار کی سطح پر مدارس کی ڈگریوں عالم اور فاضل کے امتحانات یونیورسٹی کے تحت وقت مقررہ پر منعقد ہو رہے ہیں۔ لیکن ابھی یونیورسٹی کو اپنے قدموں یعنی اپنی زمین پر کھڑے ہونے کا چیلنج ہے۔ تدریسی اور غیر تدریسی اسٹاف کا تقرر ایک بڑا مسئلہ ہے۔ UG کے متعدد کالجوں (صرف ۱۰) کا الحاق ہوا ہے، اس سلسلے کو مزید دراز ہونا ہے ساتھ ہی کیمپس میں بھی UG کی شروعات ہونی ہے۔

صورت حال یہ ہے کہ گزشتہ برس یکم فروری سے پروفیسر اعجاز علی ارشد کی مدت پوری ہونے کے بعد سے اب تک یعنی تقریباً ایک سال تک یونیورسٹی میں کوئی مستقل وائس چانسلر نہیں آیا ہے۔ ویر کنور سنگھ یونیورسٹی کے وائس چانسلر کو اضافی چارج دیا گیا ہے۔ ایک بہت ہی بامقصد یونیورسٹی کے قیام کو استحکام بخشنے میں تساہلی خواہ مخواہ جگہ پا گئی ہے۔ ۱۹۹۲ء میں مولانا مظہرالحق عربی فارسی یونیورسٹی کا قیام ہوا تھا۔ اس کے بعد سے اب تک اس یونیورسٹی کا کیمپس اور دیگر سہولیات وغیرہ کے لئے کوششیں جاری ہیں۔ اس یونیورسٹی میں کئی ایسے وائس چانسلر آئے جنہوں نے اپنی محنت اور کوششوں سے اس ادارے کو کاغذ سے زمین پر لانے کا بڑا کارنامہ انجام دیا۔ نہ صرف کئی Convocations منعقد ہوئے بلکہ مختلف ومتعدد قومی اور بین الاقوامی سیمینار، کانفرنس اور ورکشاپ کا بھی انعقاد ہو چکا ہے۔ تعلیم کا ماحول قائم ہوا ہے۔ ہزاروں طلبہ وطالبات تعلیم حاصل کر کے روزگار تک پہنچے ہیں۔

ہماری تعلیمی درسگاہوں میں یوں ہی تعلیمی ماحول برقرار ہے اور یہ اپنے مقاصد کو پورا کریں، اس کی کوششیں متواتر جاری ہیں۔ یوں بھی بہار میں اردو، عربی فارسی کے لئے خاصا سازگار ماحول رہا ہے۔ مدارس کی تعلیم کا نظام بھی دیگر مقامات سے بہتر ہے۔ ایسے میں مولانا مظہرالحق عربی فارسی یونیورسٹی اپنے وجود کے استحکام کے لئے ارباب حکومت کی طرف دیکھ رہی ہے۔ اب یہ ہم سب کی ذمہ داری بنتی ہے کہ علم وفن کے اس منبع ومخرج کو مضبوطی اور استحکام عطا کریں تاکہ ملک کی ایک نامور شخصیت مولانا مظہرالحق کو صحیح خراج پیش کیا جاسکے۔

❑❑❑

اودھ نمبر کتابی شکل میں

'نیادور' نے گزشتہ برسوں میں کئی اہم اور دستاویزی نمبر شائع کئے ہیں۔ انہیں میں سے ایک 'اودھ نمبر' بھی ہے جسے دو حصوں شائع کیا گیا تھا۔ اب اسے ایک کتابی شکل میں شائع کیا گیا ہے۔ اردو ادب وتاریخ سے دلچسپی رکھنے والے جو قارئین کرام اسے خریدنا چاہتے ہیں، وہ نیادور سے براہ راست یا بذریعۂ ای میل رابطہ قائم کر سکتے ہیں۔ اس کی قیمت ۲۰۰ر روپئے ایڈوانس دینی ہوگی اور اسے منگوانے کیلئے ڈاک یا کوریئر پر آنے والا خرچ ۵۰ر روپئے ملا کر کل قیمت ۲۵۰ر روپئے خریدار کے ذمہ واجب الادا ہوگی۔

ایڈیٹر ماہنامہ 'نیادور'

اردو زبان وادب، تہذیب وثقافت کا ایک نومولود ارتقائی مرکز

ثوبان سعید

تدوین اور کلاسیکی اردو نثر میں ماہر

جواہر لال نہرو یونیورسٹی

سے ڈاکٹریٹ

فی الحال خواجہ معین الدین چشتی اردو

عربی فارسی یونیورسٹی، لکھنؤ میں

ایسوسی ایٹ پروفیسر کے عہدے پر فائز

وطن مئوناتھ بھنجن

سیتا پور ہردوئی بائی پاس روڈ، لکھنؤ

رابطہ: 9411827716

اپریل کا مہینہ، ۲۰۱۳ء، اردو عربی فارسی یونیورسٹی میں انٹرویو کے لئے یونیورسٹی کی جانب ہمارے بڑھتے قدم، جیسے جیسے ہم یونیورسٹی کے قریب پہنچتے پہنچتے ایسا لگا کہ جیسے سامنے چٹیل میدان ہے۔ صحرا میں چلے آئے ہیں۔ گرمی کی شدت، لُو کے تھپیڑے اور سامنے تھی زیر تعمیر یونیورسٹی کی عمارت۔ ہم لوگوں کا انٹرویو تقریباً ایک مہینے تک چلتے رہے اور پھر نتیجہ ہماری تقرری کی خبر لے کر آیا۔ ۲۲/اپریل ۲۰۱۳ء کو ہم نے یونیورسٹی کے شعبۂ اردو میں بحیثیت استاد جوائن کیا۔ اس سے پہلے ہم نے لکھنؤ نہیں دیکھا تھا، وہ لکھنؤ جو ادب کا شہر نگاراں ہے۔

لکھنؤ کی لچک اور نرمی والی تہذیب میں محبت کی خوشبو رچی بسی ہوئی، اہل دل کی گفتگو ادب اور تہذیب کے نئے باب وا کرنے والی، لکھنویت اپنے آپ میں ایک شان، جو اس شہر کے باشندوں کی بولی ٹھولی، وضع قطع، آداب نشست وبرخاست، انداز گفتگو غرض ہر رنگ میں اپنی انفرادیت کے نقوش ثبت کرتی ہوئی آگے بڑھتی جاتی ہے جس کی شناخت دور ہی سے کی جاسکتی ہے۔ یہ شہر انجمنوں کا شہر ہے، ادیبوں کا نگر ہے، دل والوں کا شہر ہے، اہل سیاست کی نگری ہے۔ شعر وشاعری کا شہر ہے۔ جہاں کی تہذیب میں شعریت اور شاعری میں تہذیب ہے۔

شعر وشاعری اور تہذیبی نفاست کے اس گہوارے میں کئی علمی گہوارے آباد ہیں۔ دینی مدارس میں ندوۃ العلما لکھنؤ ہے جو شبلی کے خوابوں کی تعبیر ہے۔ چوک میں سلطان المدارس ہے جہاں کیفی اور علی سردار جعفری نے ادب وآداب سیکھے تھے۔ پرانے لکھنؤ میں فرنگی محل کے شکستہ آثار اب بھی زبان حال سے گردش ایام کی کہانی بیان کرتے ہیں۔ عصری دانش گاہوں کا تو ایک سلسلہ ہے۔

۲۰۰۹ء میں خواجہ معین الدین چشتی اردو، عربی فارسی یونیورسٹی سرکاری فائلوں سے نمودار ہوئی۔ زمانۂ قیام سے لے کر تا حال یونیورسٹی اپنی شناخت کی تلاش میں سرگرداں رہی ہے۔ کبھی اسے اتر پردیش عربی فارسی یونیورسٹی کے نام سے پکارا گیا، اور کبھی اس نے مانیہ ور کانشی رام کے سابقے کے ساتھ اپنی شناخت تلاش کرنے کی کوشش کی۔ فی الحال یہ یونیورسٹی مشہور صوفی بزرگ کے نام پر خواجہ معین الدین چشتی اردو عربی فارسی یونیورسٹی لکھنؤ کے نام سے چھٹے تعلیمی سیشن میں داخل ہو رہی ہے۔

یونیورسٹی کے قیام کے مقاصد میں بنیادی طور سے یہ بات شامل تھی کہ اس کی مدد سے اردو عربی فارسی زبان وادب کی ترویج واشاعت کی جائے گی اور اس کے کلچر کو فروغ دینے کی سمت میں پیش قدمی کی جائے گی۔ ابتدائیہ یونیورسٹی لکھنؤ کے اس اندرا بھون کے چند کمروں کے سہارے چلنی شروع ہوئی تھی جس عمارت میں اور بھی کئی سرکاری دفاتر موجود ہیں۔ یونیورسٹی کے بانی شیخ الجامعہ ڈاکٹر انیس انصاری، جو کہ بذات خود شاعر بھی ہیں اور آئی اے ایس افسر بھی، اسی اندرا بھون میں اپنے مختصر سے عملے کے ساتھ یونیورسٹی کے خطوط ونقوش درست کرنے میں مصروف عمل رہتے تھے۔ یہی مختصر سی جماعت ان کا کنبہ تھی۔ انیس انصاری کے کئی مجموعہ کلام شائع ہو چکے ہیں۔ 'ادھوری حکایت' کے نام سے ان کا کلیات شائع ہو چکا ہے۔ ان کی شخصیت 'جس کی پیری میں ہے مانند سحر رنگ شباب' کی زندہ تصویر ہے۔ وہ اردو تہذیب اور لکھنوی تہذیب کا چلتا پھرتا مجسمہ ہیں۔ اردو تہذیب اور زبان کی بقا اور ترقی کے لیے وہ ہمہ وقت سنجیدگی سے غور وفکر کرتے رہتے ہیں۔

بہر حال کسی صورت یہ یونیورسٹی اندرا بھون کی سرکاری عمارت اور فائلوں میں چلائی جارہی تھی۔ انیس انصاری جس کمرے میں بیٹھتے تھے وہ یونیورسٹی کے وی سی کا نہیں بلکہ ایک افسر کا کمرہ تھا۔ آنے جانے والے ان سے پوچھتے تھے کہ یہاں کیسے کیا کرتے ہیں تو وہ بڑی منکسر المزاجی سے بتاتے تھے کہ ہمارے پاس تو ایک کمرہ بھی ہے، جامعہ ملیہ کو ڈاکٹر ذاکر حسین نے ٹینٹ میں بیٹھ کر قائم کیا تھا۔ بہر حال انیس انصاری کسی نہ کسی صورت یونیورسٹی کو اس کی عمارت میں منتقل کرنے کے لئے سرگرداں تھے۔ وہ اور حکومت کے ارباب نظر یونیورسٹی کو اس کے ذاتی مکان میں منتقل کرنے کی فکر میں شہر کے مختلف علاقوں کا دورہ کرتے رہتے تھے۔ آخر کار اسے ایسا علاقہ نصیب ہوا جو اردو بستیوں سے ذرا فاصلے پر تھا۔ چوک ہوتے ہوئے ہردوئی روڈ سے جب ٹھاکر گنج، سرفراز گنج اور اس سے آگے دوبگا تک آئیں گے تو سیتاپور ہردوئی بائی پاس روڈ پر یونیورسٹی کا پہلا سائن بورڈ لگا ہوا نظر آئے گا، جو یہ بتاتا ہے کہ یونیورسٹی مزید آٹھ کلومیٹر پر آپ کے استقبال کے لئے موجود ہے۔ یہ علاقہ لکھنؤ میں ہوتے ہوئے بھی لکھنوی تہذیب کی سرشاریوں سے نا آشنا ہے۔ ایک زمانے میں جب مجرموں کو سزا دینی ہوتی تھی تو اہل لکھنؤ اسے گومتی کے اس پار بھیج دیتے تھے۔ گومتی پار کا یہ علاقہ اس زمانے میں کالے پانی کے مترادف سمجھا جاتا تھا۔

ہمیں یہاں جوائن کئے ہوئے خاصہ وقت گزر چکا تھا لیکن درس وتدریس کا انتظام نہیں ہو سکا تھا۔ کلاسیز شروع نہیں ہو پارہے تھے اور طلباء ایڈمیشن کے لئے بھی نہیں آرہے تھے۔ یونیورسٹی کیمپس جس علاقہ میں ہے اس کے آس پاس کی آبادی غیر اردو داں طبقہ کی تھی۔ ایک چھوٹا سا گاؤں متقی پور تھا لیکن وہاں کے لوگ بھی اردو سے نابلد تھے۔ ہم نے شاہجہاں پور کے گاندھی فیض عام کالج میں تعلیم حاصل کی تھی جہاں قدم رکھتے ہی اردو نظر آتی تھی۔ وہاں کے در ودیوار پر اردو نصب تھی۔ لوگوں کے ملنے جلنے اور گفتگو میں اردو کی تہذیب جھلکتی تھی۔ ہمیں یہاں پہنچ کر اعظم گڑھ کا شبلی کالج بہت یاد آیا جسے ہم لوگ چھوٹی موٹی علی گڑھ یونیورسٹی مانتے آئے ہیں۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اس کالج میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی تمام تر اردو تہذیب و تمدن اتر آیا ہے لیکن یہاں ایسا کچھ بھی نہیں تھا۔ یونیورسٹی کی ترقی کی پہلی منزل یہ تھی کہ اردو عربی اور فارسی زبانوں کی مخدوش صورت حال کو بہتر بنانے کے لیے مناسب اقدامات کیے جائیں۔ تعلیمی سطح پر ایسا ماحول تیار کیا جائے کہ زبان وثقافت کے روشن پہلو طلبہ کی شخصیت سازی کر سکیں اور ظاہری طور پر تہذیبی مظاہر کے چراغ روشن ہو سکیں۔ گذشتہ پانچ برسوں میں یونیورسٹی نے اپنے محدود وسائل کے سہارے اس سمت میں چند قدم بڑھائے تو ضرور ہیں لیکن حقیقی منزل ابھی دور ہے۔

ہمیں مایوسیاں گھیر رہی تھیں لیکن ڈاکٹر انیس انصاری کی کوششوں اور کاوشوں سے امید بھی باقی تھی اور بالآخر انہوں نے پہلے سیشن میں کسی طرح ۱۳۴ر بچوں کا ایڈمیشن کرا ہی دیا۔ ان کی تگ ودو سے اردو عربی فارسی کی ترویج وترقی کے لئے قائم اس یونیورسٹی کو کیمپس حاصل ہو ہی گیا تھا اور اب طلباء بھی۔ طلباء کے ایڈمیشن کے بعد یونیورسٹی میں درس و تدریس کی سرگرمیاں بڑھ گئی تھیں۔ ہمیں اپنے استاذی وجود پر اب کسی طرح کا شبہ نہیں رہ گیا تھا۔ حالانکہ ابھی بھی یونیورسٹی اپنے جس کیمپس میں چل رہی ہے، مکان اگر چہ تنگ ہے لیکن تنگ دامنی کا شکوہ نہیں ہے۔ طلبہ وطالبات کے لیے علیٰحدہ دارالاقامے تعمیر کیے گئے ہیں، جہاں خاصی تعداد میں طلبہ بود وباش کرتے ہیں۔ کھیل کود اور جسمانی ورزش کے لیے بھی یونیورسٹی نے معقول اور مناسب انتظام کر رکھا ہے لیکن فضا میں اردو تہذیب تلاش کرنا ذرا مشکل ہے۔

خواجہ معین الدین اردو عربی فارسی یونیورسٹی کا کیمپس روز بروز تعمیر وترقی کی منزلیں طے کر رہا ہے۔ اس کی بلند وبالا عمارتوں کا کیمپس شاہراہ سے گزرنے والوں کو خوش آمدید کہتا ہے اور دعوت نظارہ دیتا ہے۔ جیسے ہی کیمپس میں داخل ہوتے ہیں، داہنی طرف اکیڈمک بلاک کی عظیم الشان عمارت اپنی دونوں بانہیں پھیلائے سروقد کھڑی نظر آتی ہے۔ بائیں جانب نظر جاتی ہے تو عمارت انتظامی پورے کروفر کے ساتھ علم وعمل کی مجسم صورت بن کر کھڑی ہے۔ اس کے پیچھے بھی دو عمارتیں جھانکتی نظر آتی ہیں۔ صاف چھپتے بھی نہیں سامنے آتے بھی نہیں! ذرا دیکھیں یہ کیا ہے؟ اچھا! یہ تو طلبہ وطالبات کی قیام گاہیں ہیں۔ بڑی شان دار اور صاف ستھری؛ ہاسٹل کے پاس پہنچنے پر ایک تیسری عمارت مختلف رنگوں کی آمیزش سے مرصع نظر آتی ہے،

یہ جم خانہ ہے، صحت وتندرستی کا کارخانہ ہے۔ الٹے قدموں واپس پلٹئے تو بائیں ہاتھ کو لائبریری ہے۔ ابھی لائبریری نہیں چلیں گے۔ ذرا کچھ گھوم پھر کر اور بھی کچھ دیکھتے چلیں۔ آئے ہیں اس گلی میں تو پتھر ہی لے چلیں۔ ارے یہ شان دار عمارت کون سی ہے؟ اوہو، یہ مہمان خانہ ہے، بورڈ تو لگا ہوا ہے۔ اردو کا بورڈ اپنی تہذیبی نفاست کی عمدہ مثال پیش کر رہا ہے۔ ہندی بورڈ تو بالکل سیدھا اور سروقد کھڑا ہے، حاکمانہ تمکنت کے ساتھ، لیکن اردو سائن بورڈ نفاست و نزاکت، وضع داری اور مہمانوں کے استقبال میں سرِتسلیم خم کیے مہمانوں کو خوش آمدید کہہ رہا ہے۔

مہمان خانے سے واپسی میں عمارت تعلیمی (اکیڈمک بلاک) کا نظارہ قابل دید تھا۔ ایک ہی صف میں اساتذہ کے چیمبر بھی ہیں اور درس گاہیں بھی۔ یہ دل کش نظارہ جواہر لال نہرو یونیورسٹی کے علاوہ کہیں اور دیکھنے کو نہیں ملا۔ وہ جو ایک کہانی بچپن میں پڑھ رکھی تھی: ایک طشتری، پھر ایک کپ، پھر ایک طشتری اور پھر ایک کپ اور اسی طرح پھر ایک طشتری اور ایک کپ، اکیڈمک بلاک اسی کہانی کی آئینہ داری کرتا ہے۔ اساتذہ کے کمرے اور طلبہ کی درس گاہیں، پھر اساتذہ کے کمرے اور پھر درس گاہیں؛ بڑے بڑے ہال میں طلبہ اپنے اپنے تعلیمی مراحل طے کرنے میں مصروف۔ ہر نگاہ میں ایک خواب سجا ہوا تھا، ہر ذہن میں ایک سپنا اپنی تعبیر کی تلاش میں تھا۔ مستقبل کے خدشات اور اندیشہ ہائے دور دراز پر تبادلہ خیالات ہو رہے ہیں۔ مختلف مضامین کے طلبہ اپنی اپنی درس گاہوں میں، اور جن کی کلاسیں فی الوقت خالی ہیں، درس گاہوں کے باہر خوش گپیوں میں مصروف نظر آئے۔

طلبہ کی زبانی معلوم ہوا کہ اس یونیورسٹی میں انڈر گریجویٹ سطح پر ہر طالب علم کو اردو زبان کا ایک ابتدائی پرچہ سال بھر تک لازمی طور سے پڑھنا ہوتا ہے، اس کا مقصد یہ ہے کہ طلبہ کم کم ہی سہی ایک نئی زبان، اس کے رسم الخط، اور اس کے ادب وثقافت سے ایک حد تک واقف ہو جائیں۔ طلبہ کے بشرے قیافے سے تو اردو زبان کا کلچر بہ طور عموم مفقود تھا لیکن سرراہ ایسے طلبہ بھی ملے جو اردو عربی فارسی زبانوں کے تعلق سے سنجیدہ اور عملی طور سے اس کی ثقافت کے مظہر نظر آئے۔

عمارت تعلیمی میں اساتذہ کے کمروں پر تین تین زبانوں یعنی انگریزی، ہندی اور اردو میں ان کے نام اور عہدے کی تختیاں لگی ہوئی تھیں جو بیک وقت ہندوستان کی تین زبانوں کی نمائندگی کرتی تھیں اور اردو زبان اور رسم الخط کی وجہ سے نہاں خانۂ دل میں ایک خاص لذت اور گدگدی پیدا کر رہی تھیں۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ اور مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی حیدرآباد کے کیمپس کی زیارت کے دوران اردو زبان وتہذیب کے تعلق سے جو تاثر پیدا ہوتا ہے، اس کی جھلک یہاں مفقود تھی۔ پھر خیال آیا کہ جامعہ نے سو برس کا طویل سفر طے کر لیا ہے نیز اس نے اپنی صد سالہ زندگی میں زبان وثقافت کے کئی نشیب وفراز دیکھے ہیں۔ جامعہ نے ہندوستان کو آزادی حاصل کرتے ہوئے اور انگریزوں کو اس ملک سے جاتے ہوئے دیکھا ہے، اگر اس نے اردو کلچر کو زندہ رکھا ہے تو بڑی بات ہے۔ جامعہ نے مخالف ہواؤں کے سامنے سینہ سپر ہونے کی مثال قائم کی ہے۔ مولانا آزاد نیشنل یونیورسٹی کا معاملہ بھی قدرے مختلف ہے۔ آندھرا پردیش اور تلنگانہ میں ایسے متعدد انٹر کالج اور ڈگری کالج ہیں، جہاں ذریعۂ تعلیم اردو ہے۔ وہ طلبہ ابتدائی سے اعلیٰ سطح کی تعلیم اردو میڈیم میں حاصل کرتے ہیں، اس لیے ان کے مزاج میں اردو کا رنگ اور اس کی ثقافت کی خوشبو رچی بسی ہوتی ہے۔ ان کے مقابلے میں یہ یونیورسٹی ابھی نوزائیدہ ہے۔ اس کے تو ابھی دودھ کے دانت بھی نہیں ٹوٹے ہیں۔

ان حالات میں ابھی یہ یونیورسٹی اپنی شناخت کی تلاش میں سرگرداں ہے۔ اقبالؔ نے کیا ہی معرکے کا شعر کہا ہے:

مل ہی جائے گی تجھے منزل لیلیٰ اقبالؔ
کوئی دن اور ابھی بادیہ پیمائی کر

ایک بڑی دلچسپ اور خوش گوار تبدیلی کا احساس یہ ہوا کہ ایسے طلبہ جن کا پس منظر اردو زبان اور کلچر نہیں ہے، اور جن کے گھروں میں ابھی اردو کے تئیں اجنبیت اور رقابت کا احساس باقی ہے، وہ اس زبان کی دلکشی اور حسن کے شیدائی بنتے جا رہے ہیں۔ چوں کہ ابتدائی سطح پر ان طلبہ کو اردو زبان سکھانے کا نظم یونیورسٹی کی جانب سے کیا گیا ہے، اس لیے ابتداً پہلے چند برسوں میں بہ درجۂ مجبوری انھوں نے اس زبان سے پہلوتہی کی کوششیں کیں لیکن رفتہ رفتہ یونیورسٹی میں ایسا ماحول ومزاج بننے بنانے میں اساتذہ اور ذمہ داران کو کامیابی ملنے لگی کہ نفرت اور تعصب کی جگہ محبت اور اپنائیت نے اپنا رنگ دکھانا شروع کر دیا اور اب صورت حال یہ ہو گئی ہے کہ طلبہ میں اس زبان کو سیکھنے کے تئیں سنجیدگی کا احساس پیدا ہو چلا ہے۔ اگرچہ یونیورسٹی میں ابھی اردو کلچر رفتہ رفتہ پروان چڑھ رہا ہے، اور اس کے لیے ابھی خاصی مدت درکار ہے، لیکن ذہنی طور سے اردو خواں اور غیر اردو خواں طلبہ میں اس زبان کے تعلق سے محبت و تعصب کے جذبات میں غیر جانب داری پیدا ہو رہی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ایک دن ایسا ضرور آئے گا جب دلوں میں بیٹھی ہوئی کدورتوں کے بادل چھٹ جائیں گے، اور گردش لیل ونہار اردو کو اس کی عظمت رفتہ واپس دلانے میں کامیاب ہو جائے گی:

دل ناامید تو نہیں ناکام ہی تو ہے
لمبی ہے غم کی شام مگر شام ہی تو ہے
دست فلک میں گردش تقدیر تو نہیں
دست فلک میں گردش ایام ہی تو ہے

ایک اک کرکے ہوئے جاتے ہیں تارے روشن
مری منزل کی طرف تیرے قدم آتے ہیں

جب ہم عمارت انتظامی میں داخل ہوتے ہیں تو شیخ الجامعہ کے نام کی تختی لگی ہوئی ہے، رجسٹرار صاحب کے کمرے کے باہر مسجل کی تختی آویزاں ہے، پراکٹر کے دفتر کے باہر موڈب کی تختی لگی ہوئی ہے، فائنانس افسر کے دفتر پر افسر مالیہ کی تختی آویزاں ہے۔ یہ منظر بھی نگاہوں میں ٹھنڈک پہنچاتا ہے کہ طلبہ بہت آسانی سے اور بغیر کسی دباؤ کے اپنی درخواستیں اردو میں تحریر کرتے ہیں اور افسرانِ جامعہ فوری طور پر ان درخواستوں پر ضروری کارروائیاں کرتے ہیں۔ طلبہ کو یہ آسانی فراہم کی گئی ہے کہ وہ کسی بھی زبان میں (ہندی، انگریزی یا اردو) میں اپنی درخواستیں بھیج سکتے ہیں۔

شعبۂ امتحانات میں یہ حوصلہ افزاء اطلاع دی گئی کہ طلبہ بی اے کی سطح پر زبانوں کو چھوڑ کر ہندی، انگریزی اور اردو میں امتحانی سوالات کے جواب دے سکتے ہیں۔ یونیورسٹی نے بی اے میں تین زبانوں یعنی ہندی، انگریزی اور اردو میں پرچے فراہم کرنے کا نظم قائم کر رکھا ہے۔ طلبہ کو مزید یہ بھی سہولت حاصل ہے کہ وہ دیگر کورس یعنی بی کام، بی بی اے، بی سی اے، صحافت اور ترسیل عامہ کے پرچے بھی اردو زبان میں دے سکتے ہیں۔ اس کے باوجود یہ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اردو کی ترویج و اشاعت اور اردو کلچر کے فروغ کے لیے یہ چند اقدام ناکافی محسوس ہوتے ہیں۔

یونیورسٹی کی لائبریری پر ابھی مکمل لائبریری کا اطلاق کرنا عجلت پسندی ہوگی۔ یونیورسٹی کے وسائل محدود ہیں، طلبہ کی تعداد بھی ابھی قابل رشک نہیں ہوئی ہے۔ البتہ لائبریری میں یہ دیکھ کر یک گونہ اطمینان ہوتا ہے کہ لائبریری میں سب سے زیادہ کتابیں اردو زبان وادب سے متعلق ہیں۔ اس سلسلے میں یہ بتایا گیا کہ شعبۂ اردو کے اساتذہ اس سمت میں ایک نئی حکمت عملی پر عمل پیرا ہیں۔ لکھنؤ جو اردو زبان وادب اور تہذیب کا گہوارہ رہ چکا ہے، اور جس کی عظمت کہن کے آثار معدوم نہیں ہوئے ہیں، وہاں بہت سے ایسے اصحاب علم وفضل ہیں جن کے پاس اردو زبان وادب کا خزانہ محفوظ ہے۔ شعبے کے اساتذہ مختلف اوقات میں مختلف تدابیر پر عمل کرتے ہوئے ایسے لوگوں سے مستقلاً رابطے میں رہتے ہیں اور اس بات کے لئے کوشاں رہتے ہیں کہ ایسے حضرات اپنی کتابوں کے خزانے سے یونیورسٹی لائبریری کو مالا مال کردیں۔

نیا دور کے مختلف نمبر کتابی شکل میں

'نیادور' نے گزشتہ برسوں میں کئی اہم اور دستاویزی نمبر شائع کئے ہیں۔ انہیں میں سے 'اودھ نمبر'، محمد علی جوہر نمبر اور مجاز نمبر' بھی شامل ہے۔ پہلے اسے الگ الگ شائع کیا گیا تھا لیکن اب اسے ایک کتابی شکل میں شائع کیا گیا ہے۔ ادب وتاریخ سے دلچسپی رکھنے والے جو قارئین کرام اسے خریدنا چاہتے ہیں، وہ نیادور سے براہ راست یا بذریعۂ ای میل رابطہ قائم کرسکتے ہیں۔ اس کی قیمت ۲۰۰/روپے ایڈوانس دینی ہوگی اور اسے منگوانے کیلئے ڈاک یا کوریئر پر آنے والا خرچ ۵۰/روپے ملا کر کل قیمت ۲۵۰/روپے خریدار کے ذمہ واجب الادا ہوگی۔

ایڈیٹر ماہنامہ 'نیادور'

اس سلسلے کی اہم پیش رفت اس وقت ہوئی تھی جب مشہور نقاد پروفیسر شارب ردولوی نے اپنی تمام کتابیں بطور ہدیہ یونیورسٹی لائبریری کو کردی تھیں۔ یونیورسٹی نے بھی اس احسان کے اعتراف میں لائبریری میں گوشۂ شارب قائم کردیا ہے۔ شارب صاحب کے نام سے بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ ان کی زنبیل میں کتابوں کے کون کون سے جواہر پوشیدہ رہے ہوں گے! سودا کا کلیات جسے نسخۂ جانسن کے نام سے شہرت حاصل ہے، وہ اب اس لائبریری کی زینت میں اضافہ کررہا ہے۔ اس کے علاوہ فرہنگ آصفیہ کا وہ نسخہ جس کے بارے میں مشہور ہے کہ اس کی اساس اس اصلی نسخے پر رکھی گئی ہے جو مولف فرہنگ آصفیہ نے پہلی مرتبہ ترتیب دیا تھا، اور جس میں بہت سے الفاظ ایسے دخیل ہوگئے تھے کہ اس لغت پر پابندی لگانے کی نوبت آگئی تھی، وہ نسخہ بھی شارب صاحب کی مہربانی سے اب اس لائبریری کے خزانے میں محفوظ ہوگیا ہے۔

منشی نول کشور کو کون نہیں جانتا! کتابوں کی تصنیف، ان کے ترجمے اور ان کی اشاعت کی ایک لمبی داستان ہے۔ نہ جانے منشی جی نے کتنے لوگوں کی پشت پناہی کی، انھیں ادیب بنایا، خانماں برباد ادیبوں کے سر پر شفقت کا ہاتھ رکھا، اور انھیں تاریخ کے صفحات میں زندۂ جاوید کردیا۔ مذہبی صحائف کی اشاعت کا ایسا پروگرام مرتب کیا کہ مذہبی صحیفے بہ آسانی عقیدت مندوں کے ہاتھوں میں پہنچنے لگے۔ اس سے پہلے کتابوں کی اشاعت محدود پیمانے پر ہوتی تھی اور

کتابیں تو چھوڑیے مذہبی صحائف بھی برکت کے لیے ہی لوگوں کو دیکھنے کو ملتے تھے۔ منشی جی کی کوششوں سے مذہب اور تہذیب کے یہ روشن چراغ لوگوں کی ہتھیلیوں اور دماغوں کو روشن کرتے رہے۔ جب وقت کا پہیا سمت مخالف میں گھومنے لگا، اور منشی جی کے ادارے نے اپنا تاریخی کردار ادا کرلیا تو انھی منشی نول کشور کے ورثانے اپنا گودام خالی کرنے کے لیے تقریباً 2300 کتابیں اس یونیورسٹی کو ہدیہ کر دیں۔ اب یہ کتابیں بھی یونیورسٹی لائبریری کی زینت ہیں اور اس کے وقار میں اضافہ کررہی ہیں۔ یہ اعزاز اس یونیورسٹی کو حاصل ہے کہ کسی نہ کسی سبیل سے منشی نول کشور کے عظیم ادارے کی آخری وارث یہی یونیورسٹی کہلائے گی۔ اس سے پہلے ریختہ ڈاٹ کام کے ذمہ داران مطبع منشی نول کشور کی کتابیں دوٹرک میں بھر بھر کر دہلی لے جا چکے تھے۔

یونیورسٹی میں مختلف شعبے اپنے اپنے میدانوں میں خدمات انجام دے رہے ہیں، اور طلبہ اپنی اپنی بساط بھر ان سے کسب فیض کررہے ہیں لیکن گذشتہ پانچ برس کی قلیل مدت میں شعبۂ اردو نے مختلف ثقافتی اور علمی پروگرام کے انعقاد سے جس طرح اس یونیورسٹی کے وقار میں اضافہ کیا ہے، نیز ملک اور بیرون ملک تک اس یونیورسٹی کا نام پہنچادیا ہے، وہ بذات خود ایک اہم کارنامہ ہے۔ بلاخوف تردید یہ بات کہی جائے گی کہ شعبے نے اپنی محنت، لگن اور اولوالعزمی کی بدولت محدود وسائل کے سہارے ملک وبیرون ملک کے دانشوروں اور ادیبوں کو لکھنؤ اور اس دانش گاہ میں مدعو کرنے میں نہ صرف کامیاب ہوئی ہے، بلکہ ان سے مشورے حاصل کیے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ اردو زبان کے فروغ کے لیے ان کی تجویزوں کو عملی جامہ پہنارہی ہے۔ ان بزرگوں کی دعائیں ملی ہیں انھیں۔

شعبۂ اردو مختلف موضوعات پر لکچر اور خطبات کا اہتمام بھی کرتا رہا ہے۔ ملک زادہ منظور احمد صاحب کو متعدد مرتبہ توسیعی لکچر کے لیے زحمت دی گئی۔ پروفیسر مرحوم نے جب تک ان کی صحت ساتھ دیتی رہی، یونیورسٹی تشریف لاتے رہے، اور اپنے خطابات سے طلبہ کے اذہان کو روشن کرتے رہے۔ (خدا انھیں غریق رحمت کرے) انھوں نے جس بزرگانہ شفقت سے طلبہ کے سر پر ہاتھ رکھا تھا، اس کی برکت سے کئی طلبہ اس یونیورسٹی سے فارغ ہوکر ملک کی بہترین یونیورسٹیوں میں تعلیم حاصل کررہے ہیں۔ پروفیسر مجاور حسین رضوی صاحب نے اردو داستانوں پر توسیعی خطبہ دیا تھا۔ ایک مٹتی ہوئی تہذیب اور زبان کے یہ چند روشن مینار ہیں جنھوں نے طلبہ کے اندر ادب کا صحیح مذاق پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔

اردو تہذیب وتمدن کے تعلق سے طلبہ کی ادبی انجمن اور اس کی کارروائیوں کے ذکر کے بغیر یونیورسٹی کی کہانی ادھوری اور ناتمام رہ جائے گی۔ اکیڈمک بلاک میں چہل قدمی کے دوران جابجا بڑی سائز کے فلیکس دیواروں پر چسپاں نظر آتے ہیں۔ قریب سے دیکھنے پر پتا چلا کہ یہ تو طلبہ کی ادبی انجمن کا ترجمان ہے۔ مزید تفصیلات یہ ہیں کہ شعبۂ اردو کے طلبہ نے 'بزمِ ادب' کے عنوان سے ایک انجمن کی تشکیل کی ہے تاکہ طلبہ، دوستوں اور احباب کی تخلیقی صلاحیتوں کو ایک مناسب پلیٹ فارم دیا جاسکے۔ بزم ادب کا یہ جداری میگزین چند مخلص اور جاں باز طلبہ کی اجتماعی کاوشوں کا ثمرہ ہے۔ وہ خود ہی قلم کار ہیں، ٹائپسٹ ہیں، اس کا ڈیزائن بھی طلبہ کے جمالیاتی مذاق کی آئینہ داری کرتی ہے۔ میگزین کی صوری اور معنوی صورت گری کلی طور سے طلبہ کے خوب صورت اور بلند تخیلات کی رہین منت ہے۔ یہی قلم کار اور صورت گر اپنے مالی وسائل کے سہارے اس کی طباعت کا اہتمام کرتے ہیں۔ میگزین میں طلبہ کی تخلیقی صلاحیتوں کا بہتر طریقے سے اظہار ہورہا ہے۔ انھی کی زبانی معلوم ہوا کہ ہر مہینے کے آخری ہفتے میں کسی دن بزم ادب سجائی جاتی ہے جس میں طلبہ تخلیق وتنقید کے جوہر دکھاتے ہیں، غزلیں پڑھی جاتی ہیں، اساتذہ کی غزلوں سے بھی کام چلایا جاتا ہے اور بعض اوقات کلامِ اساتذہ کے طفیل میں طلبہ کے تخلیقی پروں میں قوت پرواز پیدا ہونے لگتی ہے۔ غزلیں ترنم سے بھی گائی جاتی ہیں، تحت اللفظ میں بھی قرأت ہوتی رہتی ہے۔ مضامین لکھے جارہے ہیں، بھری محفل میں پڑھے جاتے ہیں، ان پر تبصرے بھی ہوتے ہیں، سنجیدہ تبصروں کے ساتھ ساتھ طلبائی رقابت بھی جوان رہتی ہے، اور ادبی جملے بازیوں اور طنز وتعریض کی مشق بھی ہوتی رہتی ہے۔ بیت بازی کی محفلیں بھی آراستہ ہوتی رہی ہیں۔ طلبہ خود کہتے ہیں کہ مہینے کے آخری ہفتے میں سارا ماحول رومانی اور ادبی ہوجاتا ہے۔ کسی کا مضمون تیار نہیں ہورہا ہے، کسی کی غزل کی دھن نہیں بن پارہی ہے۔ کسی کو یہ غم کھائے جارہا ہے کہ پتا نہیں اس بار بھی اسے موقع دیا جائے گا یا نہیں۔ غرض بزم ادب کا کارواں انھیں سرد وگرم تجربات کے ساتھ آگے بڑھ رہا ہے۔ میگزین کی فراہم کردہ معلومات سے یہ بات بھی معلوم ہوئی کہ اس کے تین تین شمارے زینت دیوار بن چکے ہیں۔

'اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ'

ابھی یہ یونیورسٹی دور طفلی میں ہے، یونیورسٹیوں کی تاریخ میں دو چار برس کی زندگی کوئی اہمیت نہیں رکھتی۔ یقیناً یونیورسٹی کے لیے اہل دل اور اہل نظر کا خلوص ہے، ان کی دردمندی ہے، زبان وثقافت باقی رکھنے والے ہمدردوں کی دعائیں ہیں۔ یونیورسٹی کو ابھی ترقی کے کئی منازل طے کرنے ہیں اور بنیادی طور سے ابھی اس کے سامنے ان زبانوں کے اس کلچر کو فروغ دینے کی ذمہ داری ہے جن کی بازیافت کے لیے اس کا قیام عمل میں آیا تھا:

یہ چمن یوں ہی رہے گا اور ہزاروں بلبلیں
اپنی اپنی بولیاں سب بول کر اڑ جائیں گی

❑❑❑

اردو میں رپورتاژ کا فن اور اس کی تاریخی روایت پر ایک نظر

طلعت گل

چار کتابوں کی مصنفہ

'اردو میں رپورتاژ کی روایت'

کے موضوع پر دہلی یونیورسٹی

سے ڈاکٹریٹ،

فی الحال حکومت دہلی کے سینئر

سکنڈری کالج میں لکچرر، وطن دہلی

3358، کوچہ جلال بخاری،

بازار دہلی گیٹ، نئی دہلی

رابطہ: 9210482063

'رپورتاژ' یہ صنف اردو ادب میں فرانسیسی ادب کی دین ہے جو ترقی پسند تحریک کی منازل کو چھوتی نظر آتی ہے۔ متعدد انگریزی فارسی اور اردو کی لغات میں اس صنف کو 'رپورٹ' کے ہم معنی قرار دیا گیا ہے۔ ان لغات کی مدد سے جہاں اس لفظ کے معنی نمایاں ہوتے ہیں وہیں 'رپورتاژ' کی تعریف وضع کرنے میں بھی مدد ملتی ہے۔ لانگ مین یونیورسل ڈکشنری، ڈکشنری آف لٹریری ٹرمس، دی آکسفورڈ ڈکشنری، اسٹینڈرڈ ڈکشنری آف انگلش لینگویک وغیرہ لغات 'رپورتاژ' کا تعلق کسی خبر یا کسی اخباری رپورٹ میں گپ شپ کے انداز کے ساتھ رپورٹر کی خود اپنی ذات کا اظہار بتاتی ہیں۔ پروفیسر احتشام حسین رپورتاژ کو واقعات کی ادبی اور محاکاتی رپورٹ کہتے ہیں۔ بقول شمیم احمد 'رپورتاژ' ادب کا نہیں بلکہ صحافت کا ادبی اسلوب ہے۔ سید اعجاز حسین 'رپورتاژ' کا براہ راست تعلق تاریخ سے بتاتے ہیں۔ علی سردار جعفری کے نزدیک 'رپورتاژ' افسانے اور صحافت کے درمیان کی کڑی ہے۔ محمد حسن عسکری فرماتے ہیں کہ 'رپورتاژ' نام ہی اس لئے اختراع کیا گیا کہ بعض تحریروں کو صحافت اور ادب دونوں سے الگ کیا جا سکے۔ سجاد ظہیر 'رپورتاژ' کو ادب اور جرنلزم کی ملی جلی صنف مانتے ہیں۔ قطع نظر اس کے کہ مختلف حضرات کی 'رپورتاژ' سے متعلق مختلف آراء رہی ہیں یا کیا ہو سکتی ہیں۔ دستیاب رپورتاژوں کی روشنی میں راقم الحروف کے فن رپورتاژ نگاری کی ہیئت، تکنیک اور اسلوب کے نمونوں کو مدنظر رکھتے ہوئے مختصر تعریف وضع کرنے کی کوشش کی ہے:

'زمان و مکان کے تعین کے ساتھ چشم دید حقیقی واقعات کی حقیقی کرداروں کے ذریعہ زمانۂ حال یا زمانۂ ماضی قریب کی افسانوی انداز میں کی گئی رپورٹنگ ہی رپورتاژ ہے۔'

دراصل رپورتاژ وہ صنف ادب ہے جس میں اہم اور غیر اہم واقعات کو من وعن ان کی حقیقی شکل میں ایک فنی شان کے ساتھ پیش کیا جاتا ہے۔ اس میں معنویت اور پوری سچائی کے ساتھ خارجی تاثرات، رپورتاژ نگار کا ذاتی تاثر اور تبصرہ اور دیگر عینی شاہدین (اگر ہیں تو) کے تاثرات زبان و بیان کی خوبی کے ساتھ پیش کئے جاتے ہیں جس میں قصے، واقعے یا حادثے کو افسانوی انداز میں پیش کیا جاتا ہے۔ فن رپورتاژ نگاری میں الفاظ کے ذریعہ تصاویر کے ایک متحرک سلسلے کے ذریعہ قاری کو جائے واقعہ پر بیٹھا دیا جاتا ہے گویا وہ بنفس نفیس خود بھی اسی واقعہ سے گزر رہا ہو۔ رپورتاژ میں رپورتاژ نگار کا موضوع سے براہ راست تعلق ہوتا ہے۔

مصنف یہاں واقعے کا عینی شاہد بھی ہوتا ہے اور رپورتاژ کا کردار بھی۔ رپورتاژ میں واقعہ اور کردار مل کر رپورتاژ کا تانا بانا بنتے ہیں۔

اردو میں بیشتر رپورتاژ مصنفین کے مختلف خیالات اور نظریات کی ہی ترجمانی کرتے نظر آتے ہیں۔ نظریات و خیالات کا یہ تنوع ہی رپورتاژ کی کوئی جامع تعریف متعین کرنے میں حائل رہا۔ یوں بھی زندہ ادب کسی حد بندی یا پابندی کے تحت تحریر نہیں کیا جاسکتا۔ یہ وہ آبِ جُو ہے جب تک کناروں کو توڑ کر باہر نہ چھلکے، قاری کو متاثر نہیں کر پاتا۔ وقت کے بدلتے تقاضوں کو جس خوبصورتی سے رپورتاژ نے نئے نئے سانچوں میں ڈھلتے ہوئے پورا کیا ہے، دیگر نثری اصناف میں اس کا فقدان نظر آتا ہے۔ رپورتاژ کے ابتدائی نمونے یا تو کسی کانفرنس یا ادبی نشست کے آنکھوں دیکھے حال کی شکل میں ملتے ہیں یا کسی نہ کسی شکل میں سفر اور حالات سفر پر رپورتاژ میں موجود ہے۔ وہ مضامین یا سفرنامے جو بعنوان رپورتاژ مختلف اوقات میں مختلف رسائل و جرائد میں شائع ہوئے، خود مصنف کا رپورتاژ کے فن کے حوالے سے غلط تصور قائم کرنا (جس کے امکانات کم ہیں) اور مدیر کا کسی خاص مقصد کے تحت یہ عنوان دے دیا جانا بھی ہوسکتا ہے۔ 'ماہ نو' میں مقصدی ادب کی ترویج و اشاعت کی غرض سے اس طرح کے مضامین شائع ہوئے جو یا تو سیاسی پروپیگنڈہ تھے یا اپنی تہذیب و تمدن سے لوگوں کو متعارف کرانے کا ایک وسیلہ تھے۔ تقسیم ہند کے بعد بیشتر مضامین 'ماہ نو' میں رپورتاژ کے عنوان سے اسی مقصد کے حصول کے لئے شائع کئے گئے۔ پاکستان سے دستیاب رپورتاژ کی طویل فہرست میں اکثر ایسے ہی رپورتاژ کی ہے۔

رپورتاژ اس ہنگامہ خیز دور کی پیداوار ہے جب تمام دنیا کے ادیب و مصنفین ایک ہی پلیٹ فارم پر جمع تھے اور فاشزم اور سامراجیت کے خلاف انقلاب کا نعرہ بلند کیا تھا۔ ترقی پسند تحریک کے آغاز کے ساتھ ہی اس کے اغراض و مقاصد کی ترویج و اشاعت کی غرض سے جو رپورتاژ تحریر کئے گئے، وہ مقصدی ادب کی بھی مثال ہے۔ ۱۹۳۳ء میں لکھ کر رپورتاژ 'لاہور سے بہرام گلہ تک' اور سجاد ظہیر نے 'یادیں' ۱۹۴۰ء میں لکھ کر رپورتاژ نگاری کی باقاعدہ ابتدا کی۔ یہ اسلوب تحریر کوئی نیا نہ تھا۔ حقیقت نگاری، شعور کی رَو اور خود کلامی جیسی تکنیکوں کو نئے نئے تجربات کے تحت افسانہ، ناول، خاکے، سوانح عمری، سفرنامے وغیرہ میں پہلے ہی سے برتا جارہا تھا۔ سجاد ظہیر نے حقیقی واقعات کو حقیقی کرداروں کے افعال و اعمال کے ذریعہ کہانی پن کے ساتھ آنکھوں دیکھے سوال کی طرح پیش کیا تو یادیں قاری پر حال بن کر گزریں اور یہ انداز تحریر حقائق کو زیادہ پُراثر اور براہ راست انداز میں قاری تک پہنچانے کا بہترین ذریعہ خیال کیا گیا۔ رپورتاژ جیسی افادی صنف ادب عصری تقاضوں کی تکمیل کا ذریعہ بنی۔ حقائق کو ان کی اصل شکل میں پیش کرنے کی کوشش مصنفین کو صحافت سے نزدیک لائی اور اکثر رپورتاژ میں خبریہ انداز بھی برتا گیا۔ یہ خبریہ انداز قاری کے لئے حقائق کو ردوقبول کے پیمانے پر آنکنے میں مددگار رہا اور صحافت میں بھی رپورتاژوی انداز در آیا۔ انہیں تحریروں کے سلسلہ کا آغاز 'پودے' سے ہوا اور پھر یادیں، صبح ہوتی ہے، خزاں کے پھول، ترقی پسند مصنفین کی کل ہند کانفرنس، ایک ہنگامہ، ممبئی سے بھوپال تک، ستمبر کا چاند جیسے معیاری رپورتاژ اشاعت پذیر ہوئے۔ ذرا بعد کا زمانہ ہندوستان اور ہندوستانی سماج و معاشرے کے لئے نہایت ایذا رساں ثابت ہوا۔ جسمانی، جذباتی، نفسیاتی ہر اعتبار سے شخصی پیکر ٹوٹا، خواب چکنا چور ہوئے، سیاست اور مذہب کا شکار ہوکر انسان سے انسان کے خون سے ہولی کھیلی اور تقسیم ہند اور تبادلۂ آزادی کے موضوع پر 'دلی کی بپتا' اور 'خدا دیکھتا رہا'، جب بندھن ٹوٹے، دو ملک ایک کہانی، پو پھٹے، چھٹا دریا جیسے رپورتاژ تحریر کئے گئے۔ خون میں ڈوبے ہوئے مصنفین کے قلم تاثر اور جذبات میں لفظوں کو بھگو گئے اور قاری کی آنکھیں مصنف اور رپورتاژ کے دیگر کرداروں کے ساتھ نمناک ہوگئیں۔ تقسیم ہند کے بعد جب حالات دونوں ملکوں (ہند و پاک) میں معمول پر آئے تو دونوں طرف کے لوگ اپنوں اور اپنی سرزمین سے بچھڑنے کے کرب سے دوچار ہوچکے تھے۔ دونوں طرف کے لوگوں کے لئے ایک دوسرے ملک کے سیاسی، سماجی، معاشرتی، معاشی اور اقتصادی حالات چیلنج کرنے والے تھے۔ ایسے میں لوگوں نے جس طرح زندگی کو گوارہ بنایا اس کا ذکر شاہد احمد دہلوی کے رپورتاژ 'دلی کی بپتا' کے دوسرے حصے 'ماں'، ابراہیم جلیس کے 'دو ملک ایک کہانی'، 'جیل کے دن جیل کی راتیں'، عنایت اللہ خاں کے 'اجالوں کی طرف' جیسے رپورتاژوں میں ملتا ہے۔

بعد کے زمانے میں سفر اور رودادِ سفر کو موضوع بنا کر تحریر کئے گئے رپورتاژوں کے علاوہ چند ایسے موضوعات پر بھی خامہ فرسائی کی گئی جو بالکل عام اور روزمرہ کے تجربات سے وابستہ ہیں مثلاً شکار سے متعلق خورشید انور جیلانی کا رپورتاژ 'کیوں ترا راہگزر یاد آیا'، زہرہ جمال نے مجاز کی موت پر 'پانچ دسمبر کی ایک رات' اور منظر کاظمی نے 'ذکی انور کی موت پر' رپورتاژ لکھے جو درد و کرب اور تاثرات و احساسات میں گردن گردن ڈوبے نظر آتے ہیں۔ رودادِ سفر پر مبنی رپورتاژ 'لبیک' جو حج کے بیان سے عبارت ہے۔ سفرنامے اور رپورتاژ نگاری کے فرق اور مماثلت کے اظہار کے سلسلے میں واضح مثال کا کام دیتا ہے۔ سماج کے اقلیتی فرقے کے مسائل کو موضوع بنا کر عاتقی شاہ نے 'خالی ہاتھ' اور 'عابد روڈ سے کامرشیل اسٹریٹ' جیسے رپورتاژ تحریر کئے۔ عورتوں کے مسائل پر 'کوہ دماوند'، 'بمبئی سے بھوپال تک'، 'ڈوب ڈوب کر ابھری ناؤ' جیسے رپورتاژ منظر عام پر آئے۔

قرۃ العین حیدر نے لندن لیئر کی قسم کو

رپورتاژ نگاری میں برت کر ایک نیا تجربہ کیا۔ سلمیٰ صدیقی نے نقاب اور چہرے اور مسعود مفتی نے چہرے لکھ کر نفسیاتی اور تاثراتی رپورتاژ نگاری کی بنا ڈالی۔ اس کے علاوہ بین الاقوامی مسائل کو موضوع بنا کر جو رپورتاژ منظر عام پر آئے۔ ان میں اس کا آشوب، اے بنی اسرائیل، ستمبر کا چاند، ہم نفس وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ جنگ اور جنگ سے پیدا ہوئے دشوار گزار مراحل سے متعلق رپورتاژوں میں مسعود مفتی کے رپورتاژ 'ہم نفس' کا نام سرفہرست ہے۔

مندرجہ بالا موضوعات کے علاوہ بھی رپورتاژ تحریر کئے گئے مثلاً ندا فاضلی کے 'بمبئی سے اودئے پور تک' اور 'جشن شاعر'، 'اس رات کی بات' حمید سہروردی 'افسانے کی بات' از سراج، 'مہر بہ لب' از احمد ندیم قاسمی اور 'احساس کی یاترا' از رام لعل اور 'کولہاپور میوزم کانفرنس' از ریاست خانم۔ یہ رپورتاژ کسی مشاعرے، کسی شام افسانہ، کسی ادبی نشست اور میوزم کانفرنس پر مبنی ہیں لیکن نہ تو یہ رپورتاژ نگاری کے معیار تک پہنچ سکے اور نہ خود کو روداد سفر سے بچا پائے۔ سفرنامے اور رپورتاژ نگاری کے درمیان پیدا شدہ غلط رجحان اور رویئے کے پوری طرح شکار ہونے والے مصنفین میں عارف حجازی، ابوسعید قریشی، محمد عمر معین، اقبال حامد، طاہر احمد، ثروت خاں، اللہ بخش راجپوت، عبدالصمد درانی، رضا ہمدانی، آمنہ ابوالحسن، اسد محمد خان وغیرہ کے نام پیش پیش ہیں۔ ان کے سفرنامے یا سفر کی رپورٹیں بعنوان رپورتاژ اشاعت پذیر ہوئیں۔ فکر تونسوی جیسے مزاح نگار نے 'چھٹا دریا' لکھا، بقول شمیم احمد 'خون اور آنسوؤں کا ساتواں دریا بہا دیا' لیکن مجتبیٰ حسین نے اپنے رپورتاژ 'ایک پلیٹ تخلص بھوپالی' اور 'بتانا ہمارا کٹنگ اور پانا خطاب ہاسیہ رتن کا' مزاحیہ رپورتاژوں کی مثال ہیں۔ ثانوی اور داخلی نوعیت کی تحریریں محض رپورٹ بن کر رہ گئی ہیں اور آنے والوں میں 'شگوفہ' نے مزاحیہ رپورتاژ کے عنوان سے منظور وقار کا 'چلو حیدرآباد چلو' جاہل ناگرپوری کا 'ہنسنا منع ہے'۔ پرویز یداللہ مہدی کا 'مدیر شگوفہ وامیر شگوفہ کی دلی یاترا' جیسے مضامین بھی رپورتاژ کے عنوان سے شائع کئے۔

ذرا بعد کے دور پر اگر نظر ڈالیں تو رفیع الدین ہاشمی کا اقبال پر ایک یادگار عالمی اجتماع، سہیل آغا' بائیں اور ملاقاتیں بسلسلۂ اہل قلم کانفرنس' سائرہ ہاشمی

ساقی فاروقی

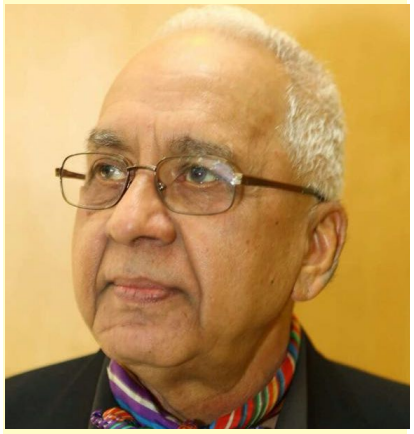

'پاپ بیتی' ہو یا ان کی دوسری تخلیقات، ایسا ممکن ہی نہیں تھا کہ ساقی فاروقی کچھ لکھیں اور عالمی پیمانے پر سرخیوں میں نہ آئیں۔ اردو ادب میں شاید ہی کوئی ان سا ہو جس نے اپنی ہر تخلیق پر خوب پذیرائی حاصل نہ کی ہو
ادارہ 'نیا دور' جولائی ۲۰۱۸ء کا شمارہ ان کے نام معنون کرنے کا اعلان کرتا ہے۔

کا 'کل پاکستان اہل قلم کانفرنس'، علی احمد فاطمی کا 'جڑیں اور کونپلیں' شہزاد انجم کا 'آزادی کے بعد اردو شاعری، مقالات اور مباحث' نعیم انیس کے دو رپورتاژ 'یادوں کے جگنو' اور 'مرشد آباد میں ایک دن' سید شعیب رضا فاطمی کے دو رپورتاژ 'قدیم دلی کالج، نشاۃ ثانیہ کا نقیب' اور 'معاصر اردو ناول، سروکار اور سمت و رفتار' علی احمد فاطمی کا رپورتاژ 'معاصر نظم، سمت و رفتار' نکہت پروین کا 'ناقابل فراموش چار دن'، ڈاکٹر ابوظہیر ربانی کے دو رپورتاژ 'آزادی کے بعد اردو نظم کی نشو و نما، نئے سروکار، نئی جہتیں' اور 'ہندوستانی اساطیر اور فکر و فلسفہ کا اثر اردو زبان و ادب پر' وغیرہ رپورتاژ صرف اور صرف اردو رپورتاژ نگاری کو ادبی کانفرنس اور نشستوں کی روداد تک مقید کر دیتے ہیں۔ کیپٹن ظفر اللہ یوشنی کا رپورتاژ 'زندگی زندہ دلی کا نام ہے' اور اختر جمال کا رپورتاژ 'بھوپوشیما' جذباتی اور تاثراتی رپورتاژوں کی عمدہ مثال ہیں۔

حالانکہ رپورتاژ نگاری وہ صنف ادب ہے جس میں موضوعات کا تنوع اور رنگارنگی ہے۔ رپورتاژ نگاری کے عمدہ نمونوں میں ادبی، مذہبی، واقعاتی، حادثاتی، مزاحیہ اور افسانوی ہر طرح کے رپورتاژ موجود ہیں۔ زندگی کے وسیع و عریض پردے پر بکھری حقیقتیں پکار پکار کر رپورتاژ نگار کو اپنی جانب متوجہ کرتی ہیں لیکن اس کے باوجود اکثر مصنفین کی سوچ اور فکر کا دائرہ محدود موضوعات کا پابند ہو کر رہ گیا۔ بدلتی ہوئی سماجی قدریں، رویوں اور معاشرے میں آنے والی تبدیلیوں نے آج انسان کو اس قدر بے حس بنا دیا ہے کہ اس پر احساس و ادراک کی پرتیں نہیں کھلتیں۔ آرام پسندی، تعیش پرستی اور تن آسانیوں نے احساسات و جذبات کو پہلے کی طرح متاثر کرنا چھوڑ دیا ہے۔ حالانکہ زندگی پہلے سے زیادہ لااعتبار اور موت ہزار ہزار درجہ یقینی ہوتی جارہی ہے لیکن عام شخص کی طرح مصنفین اور اہل علم و ہنر بھی جیسے ٹھہرے ہوئے سمندر کی طرح آنے والے طوفان کے منتظر ہیں۔ موضوعات کا ٹھہراؤ یقیناً فن رپورتاژ نگاری کو ایسی عمدہ مثالیں دے سکتا ہے جو اردو ادب میں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے مثال بن کر سامنے آسکیں کیونکہ رپورتاژ نگار صرف سچ پیش کرتا ہے اور زندگی سے بڑا سچ کوئی نہیں۔

❑❑❑

ڈاکٹر آفاق فاخری
جلالپور، امبیڈکر نگر
موبائل: 9918617576

جستجو

میں دشت جاں میں
بہت زمانے سے چل رہا ہوں
صدائیں دیتا ہوں زندگی کو
پکارتا ہوں میں خود کو لیکن
مری صدائیں
پلٹ کے خود بازگشت بن کر
مرے ہی لہجے میں
مرے ہی لفظ و بیاں میں جیسے
اتر کے مجھ سے ہی ہم کلام ہو رہی ہیں
میں دشت جاں میں پکارتا ہوں
ہر آدمی کو
ہر اجنبی کو
زندگی کو
خود اپنے آہنگ لفظ و معنی کی
ایک مدت سے جستجو میں لگا ہوا ہوں
مگر مری جستجو کا حاصل
ہے گویا اک سعیٔ رائیگاں سی

ستارۂ چشم تر

یہ سبز موسم کی شام اپنی
یہ چاند تنہا
دھواں، دھواں آسمان جیسے
رفیق شب ہائے ہجر اپنے
ستارۂ چشم تر ہی ٹھہرے
کوئی صدا ہے نہ کوئی آہٹ
نہ کوئی دستک نہ کوئی جگنو
میں کب سے تم کو پکارتا ہوں
عجب ہے آہ و فغاں کا عالم
مگر مری یہ صدائے محزوں
فلک کی جانب تو جا رہی ہے
مگر وہاں کوئی سننے والا
نہیں ہے شاید
نہیں ہے شاید
رفیق شب ہائے ہجر اپنے
ستارۂ چشم تر ہی ٹھہرے

غزل

کسی سے ہم نے کوئی بات بھی چھپائی نہ تھی
یہ صاف گوئی مگر ہم کو راس آئی نہ تھی

زمانے بھر میں جو رسوائی کا سبب ٹھہرا
وہ اس کا حسن عمل تھا کوئی برائی نہ تھی

بڑے تپاک سے اس نے مصافحہ جو کیا
صفائی ہاتھ کی تھی دل کی وہ صفائی نہ تھی

وہ جانے آنکھوں سے نکلی تھی کیسا غم لے کر
جو ایک بوند سمندر میں بھی سمائی نہ تھی

نہ اس نے چھوڑا نہ ہم نے ہی اس کو چھوڑا تھا
بدن ہی بچھڑے تھے روحوں میں تو جدائی نہ تھی

بڑا بھی ہوکے جو چھوٹا دکھائی دیتا تھا
یہ انکسار تھا اس شخص کا بڑائی نہ تھی

نہ جانے اس کی سماعت میں آئے ہم کیسے
کسی کو ہم نے جب آواز تک سنائی نہ تھی

منانا روٹھنا اور پھر گلے لگا لینا
یہ انتہائی کہانی تھی ابتدائی نہ تھی

چھڑانا دست مسائل سے خود کو کیسے نظیرؔ
میں کیا کروں میری مضبوط جب کلائی نہ تھی

میر نظیر باقری
اکروٹیہ سادات، اسمولی
موبائل: 9927193407

الجھن

بے سبب کیوں رات دن الجھا ہوں میں
کیسی الجھن ہے یہ آخر
ایک دکھ میں مبتلا ہوں رات دن
دکھ بھی کیا ہے کچھ پتہ چلتا نہیں
ہے صدا آواز تو سنتا ہوں میں
یہ صدا کس کی ہے آخر
کچھ پتہ چلتا نہیں
رات دن کا کھیل جاری ہے مگر
میرا کیا کردار ہے اس کھیل میں
ہوں پریشاں کچھ پتہ چلتا نہیں
لوگ حیراں ہے مجھے یوں دیکھ کر
اور حیراں کیوں پتہ چلتا نہیں
ایک دوجے میں الجھتے راستے
راستوں میں اپنے رستے کی تلاش
ختم ہوتی ہی نہیں میں کیا کروں
منزلوں کا کچھ پتہ چلتا نہیں
سوچتا ہوں خاک پیراہن کو میں
راستے میں چھوڑ دوں
آگے بڑھوں
بے سبب کیوں رات دن الجھا ہوا ہوں میں

خالد جمال
B17/33 A-1، تل بند یوشور، وارانسی
موبائل: 9838202248

اصغر گونڈوی
۱۸۸۴ء ۱۹۳۶ء

غزل

رنج تھا اسیروں کو بال و پر کے جانے سے
اڑ چلے قفس لے کر بوئے گل کے آنے سے

اشک دل نہیں تھمتے، دل پہ اب نہیں قابو
خود کو آزما بیٹھے مجھ کو آزمانے سے

مسکرائے جاتا ہوں اشک بہتے جاتے ہیں
غم کا کام لیتا ہوں عیش کے ترانے سے

کثرت مظاہر ہے دفتر فنا آموز
نیند آئی جاتی ہے عشق کے فسانے سے

اک نگار محبوبی اشک خوں میں پنہاں ہے
حسن کی نمائش ہے عشق کے بہانے سے

ایک ایک تنکے پر سو شکستگی طاری
برق بھی لرزتی ہے میرے آشیانے سے

لطف ہر طرح کا ہے دشت جنوں میں لیکن
پھاڑنے کو نہیں ملتا ہے گریباں کوئی

اصغر گونڈوی نے شاعری کے میدان میں اپنا ایسا رنگ جمایا کہ بیسویں صدی کے ابتدائی دور میں ان کے شاعری کے رنگ و آہنگ، تغزل، رومان غرض کہ غزل کے تمام روایتی اجزاء کو ایک نیا پیرہن عطا کر دیا۔ یہ وہ دور تھا جب یاس یگانہ چنگیزی، حسرت موہانی اور جگر مرادآبادی جیسے شعراء کی طوطی بول رہا تھا۔ غزل کو ایک نئے زاویہ سے متعارف کرانے کا سہرا انہیں کے سر جاتا ہے۔

اردو شاعری کے لئے وہ عہد اس لئے بھی خاص تھا کہ مولانا الطاف حسین حالی کی تنقیدی رویئے کے زیر اثر پوری اردو دنیا میں غزل کے خلاف ایک ماحول استوار ہو چکا تھا۔ چونکہ حالی نظم گوئی کے رجحان کو ایک تحریک کی شکل دینے میں کافی حد تک کامیاب ہو چکے تھے جس کی وجہ سے غزل کو معتوب و مطعون قرار دینے کی کوششیں ہو رہی تھیں۔ ایسے ماحول میں غزل کے ادبی منصب کو بحال کرنا، بڑی جرأت مندانہ کاوش تھی۔ اصغر گونڈوی نے غزل مخالف ماحول میں اپنے پیشرو شعراء کے ساتھ غزل گوئی کی فضا کو پھر سے ہموار کر دیا۔ ان کی غزلوں کا لہجہ خواجہ حیدر علی آتش سے مماثلت بھی رکھتا ہے۔ ان کی شاعری کا رنگ و آہنگ خالص روایت پسندانہ ہونے کے بعد بھی جدت پائی جاتی ہے لیکن ایک نظریہ یہ بھی ہے کہ معنوی طور پر اصغر گونڈوی کا کلیدی خیال اور معنوی صفات تصوف سے بھی مستعار ہے۔ ان کی ۱۳۴ویں یوم پیدائش پر بطور خراج پیش ہیں ان کی کچھ غزلیں:

غزل

خدا جانے کہاں ہے اصغر دیوانہ برسوں سے
کہ اسکو ڈھونڈتے ہیں کعبہ و بت خانہ برسوں سے

تڑپنا ہے نہ جلنا ہے نہ جل کر خاک ہونا ہے
یہ کیوں سوئی ہوئی ہے فطرت پروانہ برسوں سے

کوئی ایسا نہیں یارب کہ جو اس درد کو سمجھے
نہیں معلوم کیوں خاموش ہے دیوانہ برسوں سے

ترے قربان ساقی اب وہ موج زندگی کیسی
نہیں دیکھی ادائے لغزش مستانہ برسوں سے

جسے لینا ہو آ کر اس سے اب درس جنوں لے لے
سنا ہے ہوش میں ہے اصغر دیوانہ برسوں سے

غزل

جان نشاط حسن کی دنیا کہیں جسے
جنت ہے ایک خون تمنا کہیں جسے

اکثر رہا ہے حسن حقیقت بھی سامنے
اک مستقل سراب تمنا کہیں جسے

زندانیوں کو آ کے نہ چھیڑا کرے بہت
جان بہار نکہت رسوا کہیں جسے

سرمستیوں میں شیشہ مے لے کے ہاتھ میں
اتنا اچھال دیں کہ ثریا کہیں جسے

حسینوں پر نہ رنگ آیا نہ پھولوں پر بہار آئی
نہیں آیا جو لب پر نعرہ مستانہ برسوں سے

میں ہوں ازل سے گرم رو عرصہ وجود
میرا ہی کچھ غبار ہے دنیا کہیں جسے

لباس زہد ہو پھر کاش نذر آتش صہبا
کہاں کھوئی ہوئی ہے جرأت رندانہ برسوں سے

میری فغان درد پہ اس سرو ناز کو
ایسا سکوت ہے کہ تقاضہ کہیں جسے

دل جلوہ گاہ عشق بنا جس کے فیض سے
وہ داغ ہے کہ شاہد رعنا کہیں جسے

رفعت عزمی
105، قضیانہ، رودلی، فیض آباد
موبائل: 9451818310

شاید

شاید
تم
اداس ہو
تو میں بھی اداس
ہوسکتا ہوں
تمارے غموں میں شریک ہوکر
تمہارا ساتھ دے سکتا ہوں
مگر یہ دھیان رہے
کہ جب تم ترقی کروگے
خوشیاں تمہارے قدم چومیں گی
میں
شاید
تم سے نفرت کروں گا

غزل

پہلے کتاب زیست میں کچھ مشکلات لکھ
پھر اس کے بعد خوشیوں بھری کائنات لکھ

راہیں ہوں پرخطر تو ارادے جواں رہیں
ہر ہر قدم پہ بکھرے ہوئے واقعات لکھ

مصروفیت نے جسم کو بے جان کر دیا
آسودگی میں ڈوبی ہوئی نرم رات لکھ

بدلا نظام، ضابطے تبدیل ہوگئے
ہوتے ہیں سنگ وخار بھی گلشان صفات لکھ

ذہنوں میں انتشار کا عالم نہ رہ سکے
امن و اماں کے واسطے کچھ ادویات لکھ

شہرت مجھے نہ چاہئے دو چار روز کی
جو زندگی کے ساتھ نہ جائے وہ بات لکھ

بس ایک ہی صدا ہے ہر اک سمت مرتعش
عزمی جو تجھ کو چاہئے خود اپنے ہات لکھ

غزل

جس کا برسوں سے میں گرویدہ رہا
اس سے مل کر قلب رنجیدہ رہا

روبرو ہر دم مرے رہتا ہے وہ
پھر کہوں کیسے وہ نادیدہ رہا

راز کے اندر تھا راز ایسا نہاں
ہوکے افشا پھر بھی پوشیدہ رہا

ایسی بے بس تھی کتابِ زندگی
ہر ورق سانسوں کا بوسیدہ رہا

اس کی یادوں کی چلیں یوں آندھیاں
دل کا کچھ موسم بھی شوریدہ رہا

آہ بھرتی تھی یہ کہہ کر مفلسی
بے گھری کا بخت خوابیدہ رہا

سن کے قدسیؔ موج کی رودادِ غم
رات بھر اک سنگ نم دیدہ رہا

سید اولاد رسول قدسی
کوئنس ولیج، نیویارک امریکہ
موبائل: +1(832)352 1992

غزل

اپنے قاتل کو جو غم خوار بنا لیتا ہوں
ایک خلقت کو میں اغیار بنا لیتا ہوں

بانٹ دیتا ہوں میں خود کو بھی کئی خانوں میں
اپنے اندر کئی دیوار بنا لیتا ہوں

عمر بھر لکھتا ہوں تفسیر محبت کی مگر
اے قلم اب تجھے تلوار بنا لیتا ہوں

ایک مدت سے ہے خاموش عجب روح ضمیر
اپنے اندر اسے بیدار بنا لیتا ہوں

اپنے رفعت پہ اسے ناز اگر ہے تو رہے
خود کو بھی سایۂ دیوار بنا لیتا ہوں

ہم کو جانا ہے اگر منزل جاناں کی طرف
راستہ کوئی ہو ہموار بنا لیتا ہوں

پار کرنا ہے جو دریائے محبت یارو
اپنے ہاتھوں کو ہی پتوار بنا لیتا ہوں

میرے دامن پہ لہو رنگ جو گل بوٹے ہیں
میں تصور میں یہ گلزار بنا لیتا ہوں

میں کہاں سہل پسندی کا ہوں قائل افسر
''کام آساں ہو تو دشوار بنا لیتا ہوں''

احتشام افسر
نزد ایس۔ٹی۔اسکول، رسول پور، گورکھناتھ، گورکھپور
موبائل: 9696714716

غزل

مرے وجود پہ ہستی کسی کی چھائی تھی
کہ اپنی جان بھی اپنی نہیں پرائی تھی

جہان حرف و معنی سے کیوں ہوئی رخصت
جو چیز برسوں کی پرکھی تھی آزمائی تھی

خزاں رسیدہ چمن میں ڈھکی پڑی تھی وہی
بہارِ نَو نے جو وہ پالکی اُٹھائی تھی

گئی تھی یاد ٹہلنے تو ساتھ تحفے میں
وہ میرے گاؤں کی تصویر کھینچ لائی تھی

کلیجہ پیٹنا کیا مرگِ ناگہانی پر
جب اُس نے بھیجا بُلاوا تبھی تو آئی تھی

دبوچ لیتا تھا پَر تولتے پرندوں کو
اداس پیڑ کو یہ کیسی دھن سمائی تھی

کلامِ قند کے گرویدہ تھے دریدہ دہن
مرے بزرگوں نے وہ چاشنی بنائی تھی

نہ چاہ کر بھی منافق کے ساتھ چلنا پڑا
قدم ملا کے نہ چلتے تو جگ ہنسائی تھی

مشاہدات سے چمکا اثرؔ کا جادۂ فن
سلیقگی و فصاحت کی رہنمائی تھی

مرغوب اثرؔ فاطمی
روڈ نمبر ے، محلہ علی گنج، گیا۔ (بہار)
موبائل:9431448749

غزل

آنکھوں میں اُمیدوں کا ستارہ ہے کہ تم ہو
یہ سامنے اک حسن سراپا ہے کہ تم ہو

یہ شعر ہے مصرع ہے قصیدہ ہے کہ تم ہو
یا حرفِ سخن کا یہ تقاضہ ہے کہ تم ہو

بے سمت سفر میں ہے عجب وہمِ تمنّا
جو سایہ گزرتا ہے وہ لگتا ہے کہ تم ہو

کھلتے ہوئے گلشن کی بہاروں میں سمٹ کر
ٹھہرے ہوئے منظر کا خلاصہ ہے کہ تم ہو

کل شب مری آنکھوں نے فلک دیکھ کے سوچا
اِس چاند میں اک چاند سراپا ہے کہ تم ہو

کیا دل کے یقیں کا بھی کوئی نام نہیں ہے
یہ کفر ہے ایماں ہے بھروسہ ہے کہ تم ہو

یہ کون مجھے پار لگانے پہ تُلا ہے
موجوں کی روانی ہے سفینہ ہے کہ تم ہو

اک بر سرِ بازار تماشا ہے کہ میں ہوں
اک رقصِ جنوں کا یہ نظارا ہے کہ تم ہو

اک یہ بھی تجسّس ہے ہمہ وقت ضیاؔ کو
یہ دل مرے سینے میں دھڑکتا ہے کہ تم ہو

سید ضیاء علوی
نورنگرا یکسٹینشن، جوہری فارم، اوکھلا، نئی دہلی
موبائل: 9711194936

غزل

لگائے تھے کبھی صحرا میں جو لہو کے شجر
اجالا دیتے ہیں دنیا کو وہ نمو کے شجر

دیئے کی لَو سے جو نکلے مرے لہو کے شجر
ہوائے شر نے گرائے وہ جستجو کے شجر

رگوں میں نقرئی تہذیب کے اجالے تھے
یہی سبب تھا جو روشن تھے آبرو کے شجر

ملی جو ورثے میں وہ تو زمین بنجر تھی
لگاتے اس پہ بھلا کیسے آرزو کے شجر

کسی کے قرب کی خوشبو بکھر بھی سکتی تھی
اسی خیال سے کاٹے ہیں اپنی خو کے شجر

وہ اپنی ذات کے محور میں ٹوٹ جاتے ہیں
انا کی ضد میں جو رہتے ہیں لفظِ تو کے شجر

ندیمؔ آج تلک ہیں مری سماعت میں
چمک رہے ہیں جو پلکوں پہ خوب رو کے شجر

شاہد ندیم
نائی کی منڈی، آگرہ
موبائل: 9760929449

غزل

خواب آنکھوں میں تم اس طرح سجایا نہ کرو
دل یہ کہتا ہے کہ اتنا بھی بھروسہ نہ کرو

کچھ زمانے کی نگاہوں میں تو رہنے دو بھرم
ہر گھڑی اپنی محبت کا تقاضا نہ کرو

میری خاموشی بیاں کرتی ہیں آنکھیں میری
تم مرے ضبط کو اب اور دوبالا نہ کرو

اپنے الفاظ کا پتھر نہ چلاؤ مجھ پر
شیشۂ دل مرا اس طرح سے توڑا نہ کرو

وعدہ کرتے ہو تو قائم بھی رہو وعدوں پر
راہ چلتے ہوئے اب ہم کو جلایا نہ کرو

غیر کیا کہتے ہیں کہنے دو میرے بارے میں
تم مجھے چشم حقارت سے تو دیکھا نہ کرو

اس طرح دیکھ کے اے جان لرز جاتی ہوں
دل کی دنیا میں دبے پاؤں تم آیا نہ کرو

تم اگر ترک وفا کر بھی چکے ہو تو سنو!
میری جانب کبھی اب مڑ کے بھی دیکھا نہ کرو

ٹوٹ کر چاہو مری طرح سے تم بھی اے نشاطؔ
میری آنکھوں میں رہو اور ستایا نہ کرو

نشاط فاطمہ
سبزی باغ، پٹنہ (بہار)
موبائل: 7543978955

غزل

محبت کا اثر ایسا ہوا ہے
جو میرا دل تھا وہ تیرا ہوا ہے

چلو اشعار کے کچھ رنگ بھر دیں
غزل کا کینوس پھیلا ہوا ہے

نہ پانی ہے نہ طغیانی نہ موجیں
عجب انداز کا دریا ہوا ہے

مرے محبوب کو دیکھا جو اس نے
تو چہرہ چاند کا اترا ہوا ہے

وہ گزرے تھے کبھی اس رہگذر سے
ابھی تک راستہ مہکا ہوا ہے

دل اپنی ہوشمندی پر تھا نازاں
مگر تیرا یہ دیوانہ ہوا ہے

جو ہے رضوانؔ ان کا مسکرانا
وہ میرے واسطے تحفہ ہوا ہے

رضوان علی خان
شیخ سرائے، سیتاپور
موبائل:9415640294

غزل

بے پر و بال پرندے کے بھی پر آ گے ہیں
اب مری خاک کو اڑنے کے ہنر آ گئے ہیں

اپنے چہروں پہ لئے گردِ سفر آ گئے ہیں
آنکھ تو کھول ترے لخت جگر آ گئے ہیں

دامن دشت ترے سائے میں آ کر مجھ کو
ایسا محسوس ہوا جیسے کہ گھر آ گئے ہیں

شہر ادراک میں اب خاک اڑے گی ہر سو
تیرے دیوانے سر راہ گزر آ گئے ہیں

کیا عجب لوگ ہیں یہ، اذن سفر سنتے ہی
اپنے ہاتھوں میں لئے اپنا بھی سر آ گئے ہیں

ایک تو ہے کہ ہمہ وقت ہے شمشیر بکف
اور اک ہم ہیں کہ بے تیغ و سپر آ گئے ہیں

منتشر ہونے لگی ہے صفِ اعدا آصفؔ
ایسا لگتا ہے کہ نزدیک ظفر آ گئے ہیں

محمد آصف صفوی
232/99، نالہ روڈ، کانپور
موبائل: 9889875352

غزل

ہم ایسے سر پھرے دنیا کو کب درکار ہوتے ہیں
اگر ہوتے بھی ہیں بے انتہا دشوار ہوتے ہیں

ذرا سی بات ہے اسکا تماشا کیا بنائیں ہم
ارادے ٹوٹتے ہیں حوصلے مسمار ہوتے ہیں

شکایت زندگی سے کیوں کریں ہم خود ہی تھم جائیں
جو کم رفتار ہوتے ہیں وہ کم رفتار ہوتے ہیں

گلے میں زندگی کے ریسمان وقت ہے تو کیا
پرندے قید میں ہوں تو بہت ہوشیار ہوتے ہیں

جہاں والے مقیّد ہیں ابھی تک عہد طفلی میں
یہاں اب بھی کھلونے رونق بازار ہوتے ہیں

گلوے خشک انکو بھیجتا ہے دے کے مشکیزہ
کچھ آنسو تشنہ کاموں کے علمبردار ہوتے ہیں

بدن ان کو کبھی باہر نکلنے ہی نہیں دیتا
قمر عباس تو باقاعدہ تیار ہوتے ہیں

عباس قمر
122A، بلوا گھاٹ، نزد قلعہ گیٹ، جونپور
موبائل: 7042154904

غزل

راستے گم ہیں برائے رہروانِ انتظار
اور الٹا چل پڑا ہے کاروانِ انتظار

اس دلِ مضطر میں اسکی دید کی خواہش لئے
عمر بھر لکھتا رہا میں داستانِ انتظار

میرا خالی پن مجھے آواز دے کر چھپ گیا
رہ گیا میرے مقابل اک جہانِ انتظار

میں کہ آوارا ہی بھٹکا رات بھر سڑکوں پہ اور
راہ میں آیا نہ کوئی آستانِ انتظار

یہ مری قسمت تھی یاروں سو ہوا مجھ پر عیاں
مجھ کو کب منظور تھا یہ امتحانِ انتظار

یہ مرا سر ہر کسی شے پر گراں ہوتا نہیں
ہو مبارک تجھکو یہ تیرا گمانِ انتظار

اس زمیں کو بھی نہیں حاصل ہوئے میرے سجود
اور مصلے پر بچھا ہے آسمانِ انتظار

سلمان خان خیالؔ
بہادر پور، کرسی روڈ، لکھنؤ
موبائل: 9119646369

غزل

میری بھی دنیا سے کوئی عادت ملتی کاش
مجھکو اپنے پاگلپن سے فرصت ملتی کاش

وہ سورج کو تکنے والا میں جگنو کی دیوانی
ہم دونوں کے بیچ بھی کوئی رغبت ملتی کاش

جس پہ تم نظمیں لکھتے ہو اور مجھ کو دکھلاتے ہو
اس لڑکی سے میری بھی کچھ صورت ملتی کاش

بس اپنے پر پھیلا پاتا ہوتی کچھ تسکین
پنچھی کو پنجرے میں اتنی وسعت ملتی کاش

تیرے ساتھ بتائے لمحے میں پھر سے جی لیتی
اک پورے جیون کی مجھکو مہلت ملتی کاش

دنیا میں بس عشق کرو اور گوہر سب کچھ چھوڑو
ایسی بھی شرطوں کے بدلے جنت ملتی کاش

عائشہ ایوب گوہر لکھنوی
201، تھرڈ فلور، وجے کھنڈ، گومتی نگر، لکھنؤ
موبائل: 9453168082

غزل

مرکز حرف تکلم تھا بیاں تک نہ ہوا
اک ترا ذکر تھا جو میری زباں تک نہ ہوا

شوق پرواز میں پر ٹوٹ گئے طائر کے
وہ یقیں تھا کہ مرے دل کو گماں تک نہ ہوا

کیا عجب طرفہ تماشا ہے تری بستی میں
میں نے اک عمر گزاری ہے مکاں تک نہ ہوا

جس کے ہونے پہ نہ ہونے کا گماں ہوتا ہے
وہی گلدستۂ جاں صَرفِ خزاں تک نہ ہوا

میں نے دنیا تری تخلیق پہ سوچا تھا بہت
راز گم گشتۂ محبوب عیاں تک نہ ہوا

بس کہ اب ختم ہوا سلسلۂ سوز و گداز
دل مرا جل بھی گیا اور دھواں تک نہ ہوا

زندگی حرف فنا کے لیے تحریک قمر
روح باقی رہی اور کوئی زیاں تک نہ ہوا

قمر عباس قمر
نیم تل بڑا گاؤں گھوسی ضلع مئو اتر پردیس
موبائل: 9044838769

مغربی تہذیب ایشیائی معاشرت پر غالب آگئی

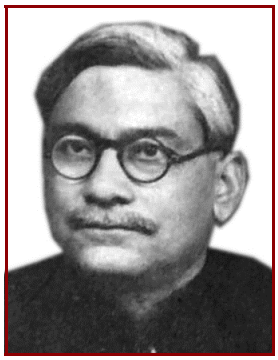

مرزا جعفر حسین

معروف ادیب ومورخ

شاہان اودھ کے لکھنؤ کی

تہذیبی، سماجی، ثقافتی اور

زوال پذیر تاریخ کے مستند مورخ

پیدائش: ۱۸۹۹ء

وفات: ۱۹۸۹ء

مغربی تہذیب اور ایشیائی معاشرت میں زمین وآسمان کا فرق تھا۔ دونوں میں بنیادی طور پر تباین تھا اور اتنے شدید اختلافات تھے کہ دونوں کے لئے وجود باہمی کے قرائن نکالنا بھی محال تھا۔ ایک نظام دوسرے کو برداشت ہی نہیں کرسکتا تھا۔ اودھ بالخصوص لکھنؤ میں جو معاشرہ پروان چڑھ کر معراج کمال تک پہنچا تھا وہ حقیقتاً مقامی ہندو روایات اور ایرانی جاہ وجلال کا ایک حسین وجمیل اور دلفریب انضمام کا ماحصل تھا۔ وہ تہذیب نہ خالص ہندوستانی تھی اور نہ کلیتاً ایرانی تھی۔ ہندوستان اور ایران دونوں ایشیائی ممالک تھے اس لئے ہم اپنی پرانی تہذیب کو ایشیائی معاشرت کہنے میں یقیناً حق بجانب ہیں۔ اس کلچر کو فرمانروایان اودھ کی سرپرستی حاصل تھی اور انہوں نے یکے بعد دیگرے اس معاشرہ کو فروغ دینے کی بھرپور کوشش کی تھی۔ یہ انہیں کی مساعیٔ جمیلہ کا نتیجہ تھا کہ انہیں کے دورِ اقتدار میں ایک زبردست احساس برتری لکھنؤ والوں میں پیدا ہوگیا تھا۔ انہوں نے پوری خود اعتمادی کے ساتھ تہذیب کو نئے آب ورنگ سے جلا دی، دولت وثروت کی فراوانی کی بدولت ان کی طبیعتیں عیش سامانی کی طرف متوجہ ہوئیں، اولوالعزمی نے ان رجحانات پر صیقل کی جس کی وجہ سے طوائف کو بلند مرتبہ حاصل ہوا اور رقص وموسیقی کے فنونِ لطیفہ اس پایۂ عروج تک پہنچے، جس کا پہلے تصور بھی نہیں کیا جاسکتا تھا۔ ساتھ ہی ساتھ مزاجوں میں نفاست ولطافت اور نزاکت وملاحت کے جوہر بھی نکھرتے رہے اور کردار میں انسانیت وشرافت اور اخوت ومحبت کے گہرہائے شاہوار غلطاں ہوگئے۔ اس تہذیب کا دامن علم وفضل سے بھی مالا مال تھا۔ اگر ایک طرف شعر وسخن کی گرم بازاری تھی تو دوسری طرف فرنگی محل اور خاندانِ اجتہاد کے روشن چراغ دعوتِ ایمان دے کر خواص وعوام کو پاک بازی وخوش اطواری کی تعلیم دے رہے تھے۔ ان دونوں مراکزانِ علم وادب نے مذہب کو تنگ نظری اور عصبیت سے دور رکھ کر امیر وغریب کو پاسداری اور رواداری پر اس طرح آمادہ کردیا تھا کہ لکھنؤ والوں کا بلا امتیازِ مذہب وملت قومی یکجہتی اور جذباتی ہم آہنگی ایک طریقۂ کار بن گیا تھا۔ لیکن ان تمام خوبیوں اور اچھائیوں کے باوصف یہ کلچر رؤسا وعمائدین کی سرپرستی میں پروان چڑھا تھا۔ یہ امراء ورؤسا دربارِ شاہی پر سہارا لگائے ہوئے تھے۔ یہ سچ ہے کہ لکھنؤ کی تہذیب وثقافت کے معمار یہاں کے امیر وغریب، رئیس وفقیر، عالم وجاہل، شیعہ سنی، ہندو مسلمان سبھی تھے۔ لیکن سماج کا نظام اس طرح تعمیر ہوا تھا کہ دربار سے عمائدین وخواص اور عمائدین وخواص سے عوام وابستہ تھے۔

اس وابستگی کا صرف اتنا فائدہ ہوا، اگر اس کو فائدہ کہا جائے کہ انتزاعِ سلطنت کے بعد بھی تخمیناً ستر اکہتر برس تک اس گلستانِ جانفزاں کی بہاریں اپنا وجود بڑی حد تک برقرار رکھ سکی تھی۔ رؤسا و عمائدین اپنی تہذیب و ثقافت کو کلیجے سے لگا رہے تھے لیکن جب اس مہتمم بالشان عمارت پر داخلی و خارجی دونوں طرف سے ضربیں پڑنے لگیں تو یہ قلعہ مسمار ہو گیا۔ سب سے بڑی اور کاری ضرب مغربی یعنی انگریزی اقتدار تھا۔

مغربی تہذیب پر سیاسیات غالب تھے۔ انگریز انیسویں صدی عیسویں میں یورپ کی تمام دوسری قوموں سے سیاسی سوجھ بوجھ میں بہت آگے تھے۔ وہ ہندوستان میں تاجرانہ حیثیت سے آئے تھے لیکن ابتدا ہی سے ان کی نظر ملک گیری پر تھی۔ اودھ کے نظم و نسق میں انہوں نے آصف الدولہ کے عہد ہی سے نفوذ حاصل کر لیا تھا اور ان کے یہ اثرات برابر بڑھتے ہی گئے تھے یہاں تک کہ فوج پر ان کا مکمل تسلط تھا اور انتظامی معاملات میں بھی دخل دینے لگے تھے۔ فرمانروایان اودھ اپنی بے بسی سے متاثر تھے اور ان میں مقاومت کی بالکل طاقت نہیں تھی۔ آخری حکمراں واجد علی شاہ اپنی کمزوریوں سے بالکل واقف تھے اور ہمہ وقت ان کو اس شدید ڈکیتی کا خدشہ لگا رہتا تھا جو انگریزوں نے بالآخران کی مملکت پر ڈالا۔ واجد علی شاہ کو لکھنؤ، لکھنؤ والوں اور لکھنؤ کلچر سے گہرا قلبی تعلق تھا۔ ان کے پیش نظر مملکت چھن جانے کا خوف تو تھا ہی لیکن وہ یہ نہیں چاہتے تھے کہ بوستان لکھنؤ تاخت و تاراج ہو جائے اس لئے وہ عنان حکومت سے دست کش ہو کر یہ فرماتے ہوئے رخصت ہو گئے کہ

در و دیوار پہ حسرت سے نظر رکھتے ہیں
خوش رہو اہل وطن ہم تو سفر کرتے ہیں

انگریزوں نے اپنی حکمت عملی سے اودھ کی مملکت پر قبضہ کیا اور ان کے پیش نظر اس وقت صرف یہ ایک مقصد تھا کہ اقتدار برقرار رہے۔ اس مقصد کے حصول میں وہ کوشاں رہے۔ سیاسیات کو بالخصوص دوسرے کا ملک چھین لینے کی سیاست کو کوئی لگاؤ صداقت و انسانیت سے نہیں ہوتا۔ چنانچہ انگریز سلامت روی، نرم کلامی اور خوش اخلاقی سے بے نیاز ہو کر اپنے کاروبار میں لگ گئے۔ ہمارے رؤسا و عمائدین سیاسیات سے بے بہرہ سیاسی چالوں اور شاطرانہ ترکیبوں سے یک لخت بے بہرہ تھے۔ اس کے علاوہ وہ دربار کی تباہی دیکھ چکے تھے۔ ان کی آنکھوں میں واجد علی شاہ کی معزولی کے بعد دنیا اندھیری ہو گئی تھی اور ان کی ساری آس ٹوٹ چکی تھی۔ اس لئے انہوں نے گوشہ نشینی اختیار کر لی۔ عمال حکومت اور سرکاری عہدیدار انگریز سے بیحد خائف رہتے تھے۔ اپنے محلوں اور اپنی محل سراؤں اور ڈیوڑھیوں میں پرانی طرز کو نباہتے ہوئے ایام گزاری کرتے رہتے تھے۔ لیکن انہوں نے اپنی آن بان اور سارا شاہانہ تزک و احتشام ہر حالت میں برقرار رکھا تھا۔ اسی مقام پر یہ بات بھی کہنے میں آتی ہے کہ واجد علی شاہ کی یہ ہوش مندی تھی کہ وہ انگریزی تسلط کے پہلے ہی حکومت سے دستبردار ہو گئے تھے ورنہ قرینہ یہی ہے کہ بادشاہ کے متعلقین اور متمسکین کے ساتھ بھی وہی برتاؤ ہوتا جس کا مظاہرہ دلی کے لال قلعہ میں ہوا تھا۔ یہاں انگریزوں کو قبضہ سنبھالتے ہی انتظام کی فکر دامن گیر ہوئی اور انہوں نے اس شہر کے رؤسا و عمائدین کو غالباً ناکارہ سمجھ کر آزاد چھوڑ دیا۔ حقیقت امر بھی یہی تھی کہ یہاں کے رؤسا و عمائدین کوئی مدافعت کر ہی نہیں سکتے تھے۔ ان کے پاس نہ کوئی فوج تھی اور نہ کوئی پلٹن۔ اسلحہ ضرور تھے لیکن ان کو طاقت کے بل بوتے پر ضبط کیا جا سکتا تھا جیسا کہ ہوا۔ مختصر یہ کہ رؤسا و عمائدین اپنی حالت پر برقرار رہے اور ان کے دم سے لکھنؤ کی تہذیب اس وقت برقرار رہ گئی۔ انگریزوں نے پرانی ثقافت کو فی الفور مٹانے کی کوئی کوشش نہیں کی بلکہ وہ رئیسوں کے اصراف والی خصلت میں اس لئے ہمت افزائی کرتے رہے بدیر و زود سب کی تباہی کا انہیں یقین تھا۔

انگریزوں نے اودھ میں بھی اپنا اقتدار مستحکم کرنے کے لئے سب وہی ترکیبیں چلائی تھیں جن کو وہ دوسرے صوبہ جات میں کامیابی کے ساتھ چلا کر تجربات حاصل کر چکے تھے۔ ان کا طریق کار یہ تھا کہ وہ اپنے پیشرو فرمانروا کے متعلقین اور متمسکین کو تباہ کر دیتے تھے تاکہ بغاوت کا کوئی خدشہ باقی نہ رہے۔ اس کے علاوہ وہ خواص و عوام میں اپنا نفوذ بڑھاتے تھے لیکن لڑاؤ اور حکومت کرو کی پالیسی پر سختی کے ساتھ کاربند رہتے تھے۔ اودھ کی مملکت پر انتہائی جعل سازی سے قبضہ کیا اور اس کے بعد اپنی تمام شاطرانہ چالیں انتہائی ہوش مندی اور تدبر کے ساتھ چلاتے رہتے تھے۔ سیاسی چال بازیوں کے پردے فاش کرنا سہل نہیں ہوتا کیونکہ درون پردہ وہی عناصر کارفرما ہوتے ہیں جن کو عوام اپنا ہی سمجھتے ہیں البتہ جو واقعات رونما ہوتے ہیں انہیں سے نتائج اخذ کئے جا سکتے ہیں۔ چنانچہ ہم نے یہ دیکھا تھا کہ انتزاع سلطنت کے بعد یہاں کے رؤسا و عمائدین انگریزوں سے اتنا زیادہ خائف تھے کہ کسی عدالت کا کوئی مذکر کسی معمولی کام سے آجاتا تب بھی یہ لوگ دہل جاتے تھے۔ اس کے پاس کوئی فوج یا پلٹن نہیں تھی اس لئے کسی مسلح بغاوت کا ڈر نہیں تھا۔ البتہ اسلحہ تھے وہ آہستہ آہستہ ضبط کر لئے گئے اور قانونی پابندیاں عائد کر کے واپس ہوئے۔ البتہ ان عمائدین کے اقتدار کا واحد ذریعہ ان کا وہ وقار تھا جس کے وہ خواص و عوام سب کی نظر میں مالک تھے۔ یہ وقار بڑی حد تک ان کی دولت و ثروت کی بدولت تھا جس کے زوال آمادہ حالات فی الفور آگے آچکے تھے پھر بھی یہ وقار اس قومی یکجہتی اور جذباتی ہم آہنگی کا بھی عطیہ تھا جو لکھنؤ کی معاشرت میں طرۂ امتیاز کی حیثیت رکھتا تھا۔ تاریخ کا مطالعہ واضح کرتا ہے کہ

انیسویں صدی کے اواخر میں اس جذباتی ہم آہنگی اور قومی یکجہتی کو ٹھیس لگنا شروع ہوگئی تھی۔ یہ پہلی ٹھیس بھی مذہبیت کے نام پر لگی تھی۔ فرمانروایان اودھ عقیدتاً شیعہ تھے۔ شہر کے رؤسا و عمائدین میں اکثریت شیعہ مسلمانوں کی تھی اور یہ تمام آبادی صرف ایک خاندان اجتہاد سے مسئلہ تقلید کے تحت منسلک تھی۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ اس خاندان اجتہاد کو آصف الدولہ کے عہد ہی میں فضیلت حاصل ہوچکی تھی اور باوجودیکہ شیعیت درباری مذہب قرار پاچکی تھی لیکن رشد و ہدایت حاصل کرنے کے لئے تمام حکمرانوں کے دور اقتدار میں ایک سو پچیس برس تک اسی خاندان کو قیادت کا شرف حاصل رہا تھا۔ ۱۸۵۷ء کے مظاہرات کے بعد انگریز اس خاندان سے ناخوش ہوئے۔ راقم کے والد مرحوم نے اس ناخوشی کے تین اسباب بتائے تھے جن میں صرف دو حافظے میں موجود ہیں۔ ایک تو یہ کہ اسی خاندان کے سربراہ برجیس قدر کو تاج پہنا دیا تھا کہ تاکہ فوج اپنے کو بغیر بادشاہ کا نہ سمجھے۔ ہر بادشاہ کو تاجپوشی کے موقع پر تاج پہنانے کا شرف اسی خاندان کے بزرگ کو حاصل رہا کرتا تھا۔ دوسری ناخوشی کی وجہ یہ تھی کہ انگریز امامباڑہ آصفی کو اپنا فوجی مرکز بنائے ہوئے تھے۔ مجتہد العصر نے یہ کہہ کر امام باڑہ ہماری مقدس عبادت گاہ ہے، تخلیہ کا مطالبہ کیا تھا۔ مختصر یہ کہ اس خانوادہ پر انگریزوں کو قطعاً اعتبار نہیں تھا۔ بیسویں صدی کے اوائل میں مسلمانوں کے دو فرقوں کو باہم دگر خانہ جنگی کا اکھاڑہ بن گیا تھا۔ اس نفاق و شقاق کا بیج ایسا بویا گیا کہ اس کا پودا آج چھتنار درخت کی صورت میں ہمارے سامنے ہے۔ فتنہ کو ختم کرنے کے بجائے حاکمان وقت کی خواہش یہ تھی کہ یہ جھگڑا ابدالآباد تک برقرار رہے۔ مسلمانوں کے دونوں فرقوں کے درمیان جو مسئلہ مابہ النزاع تھا اور ہے، اسکے بارے میں ہم کوئی اظہار خیال کرنا پسند نہیں کرتے البتہ اتنا ضرور کہنا ہے کہ اس قضیۂ نامرضیہ کی بدولت ہماری معاشرت کو ناقابل تلافی نقصان پہنچا۔ کہنے کو یہ تنازعہ شیعوں اور سنیوں کے درمیان تھا لیکن سماج کا شیرازہ منتشر ہوگیا۔ بردران ہنود بھی بددل ہوگئے۔ انگریزوں کی لڑاؤ اور

> 'نہ روم، نہ اتھینس، نہ قسطنطنیہ اور نہ ہی کوئی دوسرا شہر اتنا دلکش اور دلفریب ہوگا جتنا یہ شہر'
>
> ۱۸۵۸ میں لندن کے ٹائمس اخبار کے نامہ نگار ولیم رسیل نے یہ جملہ لکھنؤ کے لئے اپنی ایک رپورٹ میں لکھا تھا۔ سیدھے سادے لفظوں میں یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ نوابین اودھ کا عہد اپنی تمام تر خصوصیات کے ساتھ پورے ہندوستان کے افق پر غالب تھا۔ لکھنؤ شہر کی شان و شوکت کے قصے عالمی سطح پر مشہور ہونے لگے تھے۔ نواب شجاع الدولہ اور آصف الدولہ کے دور کے لکھنؤ کو جتنی مقناطیسیت حاصل ہوئی، اتنی شائد ہی دوسرے کسی شہر کو نصیب ہوئی ہو۔
>
> پھر وہ دور بھی آیا جب شاداب کلیاں بادِ سموم کے جھونکوں سے کملانے لگیں اور سارا ماحول تغیر پذیر ہوگیا۔ پرانی قدروں پر نیا مزاج حاوی ہونے لگا تب اس شہر کی ہیئت بدل گئی۔ لکھنؤ اپنے شاندار ماضی سے مستقل نبرد آزما رہتا ہے، دور کوئی بھی ہو، شعراء، ادباء اور فنکاروں کی دلچسپی اب بھی اسی گزشتہ لکھنؤ میں زیادہ نظر آتی ہے۔
>
> **'دامن کو چھوڑتی ہی نہیں لکھنؤ کی خاک'**
>
> اسی کے پیش نظر 'نیا دور' کے ہر شمارے میں 'گزشتہ لکھنؤ' کے عنوان سے ایک نہ ایک ایسی تحریر پیش کی جائے گی جس میں خطۂ اودھ اور بالخصوص لکھنؤ کے ادبی و تہذیبی سماج کی عکاسی نظر آئے۔ مقصد بازیافت ہے۔ اس سلسلہ کی دسویں کڑی کے طور پر **مرزا جعفر حسین** کی کتاب **گزشتہ لکھنؤ** سے ایک تحریر **'مغربی تہذیب ایشیائی معاشرت پر غالب آگئی'** حاضر ہے۔ ہمیں امید ہے کہ یہ سلسلہ پسند کیا جائے گا۔ 'نیا دور' ایسی تمام تحریروں کا خیر مقدم کرے گا جن میں گزشتہ لکھنؤ کی جھلک نظر آئے۔
>
> **(ایڈیٹر)**

حکومت کرو والی پالیسی کامیاب ہوئی۔ پہلے شیعہ برادری افراتفری میں مبتلا ہوئی پھر شیعہ سنی تصادم کے باعث قومی یکجہتی مجروح ہوئی۔ ہندو مسلم فساد تو ہو ہی نہیں سکتا تھا۔ یہاں تک کہ مادر وطن کی تقسیم کے بعد بھی نہیں ہوا کیونکہ ہمارے شہر کے کلچر کی جڑیں بہت گہری سماج میں اتر چکی تھیں۔

سامراجی طاقت کی حکمت عملی کا تیسرا پہلو ہماری سوسائٹی میں نفوذ کرکے اپنے رنگ میں ہم کو رنگ لینا تھا۔ اس کا روبار کو انہوں نے نہایت عقلمندی سے چلایا تھا۔ تعلقہ داروں کا طبقہ بڑی حد تک ان کا مرہون منت تھا۔ اعلیٰ حکام سے ان عمائدین کے تعلقات بھی تھے۔ بعض تعلقہ داروں نے اپنے بچوں کے اتالیق انگریز ملازم رکھے تھے۔ ان انگریزوں نے اپنے اثرات استعمال کئے، دل کھول کر خود بھی مستفید ہوئے حالانکہ بعض تعلقہ داروں پر ان کے اخلاقی اثرات بہت کم پڑے۔ مثال کے طور پر راجہ صاحب اترولہ کے صاحبزادوں کی مثال پیش کی جاتی ہے جن کا اتالیق ان لڑکوں کے سن بلوغ تک پہنچ جانے کے ایک مدت بعد تک ایک انگریز مقرر رہا تھا لیکن وہ انگریز دونوں صاحبزادوں میں کسی ایک کو بھی متاثر نہیں کرسکا اور وہ ہماری قدیم تہذیب کے دلدادہ رہے۔ لیکن ایسی مثالیں خال خال تھیں۔ پرنس باقر علی خاں کا ایسا اولوالعزم رئیس اور پرانی معاشرت کا دلدادہ اپنے انگریز استاد سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکا۔ ان کا دسترخوان اور ان کے باورچی خانے کے کھانے شہر میں مشہور تھے لیکن انہوں نے کرسی، میز پر کھانا اختیار کرلیا تھا اور صرف غذائیت نوش فرماتے تھے جن کے پکانے کے لئے علیٰحدہ باورچی نوکر تھا۔ مرزا بہادر مرزا محمد صادق علی خاں کے ایسے قدیم روایات کے علمبردار کے یہاں بھی ۱۹۳۸ء کے بعد دسترخوان بچھنے کا طرز ختم ہو گیا تھا اور انہوں نے بھی کرسی میز اور ٹم ٹم گھوڑو کے بجائے موٹر کار کا کلچر اختیار کرلیا تھا۔ ان کے علاوہ بعض اور رئیسوں کے یہاں بھی تختوں کے چوکوں کے بجائے صوفاسٹ بچھ گئے تھے لیکن انگریزی زبان اور انگریزی تعلیم و معاشرت سے عام مسلمانوں میں ایک مدت تک نفرت برقرار تھی۔ خان علامہ نواب تفضّل

حسین کے خانوادہ میں جو شہر میں تعداد افراد کی بنا پر سب سے بڑا خاندان تھا، راقم سے پہلے صرف برادر محترم جعفر علی خاں اثرؔ مرحوم نے انگریزی تعلیم کی طرف توجہ کی تھی اور بی اے پاس کیا تھا۔ وہ اپنے والد مرحوم کے بہت محبوب فرزند تھے اور ان کی خوشی ہمہ وقت مدنظر رہتی تھی اس لئے وہ اپنی اس خواہش میں بہ آسانی کامیاب ہوگئے تھے۔ راقم کو اپنی بدنصیبی سے انگریزی پڑھنے کے لئے والدین کی بغاوت اور والد مرحوم کی خصوصیت کے ساتھ شدید ناراضگی برداشت کرنا پڑتی تھی۔ عام مسلمانوں میں بھی ایک مدت تک انگریزی تعلیم سے نفرت ہی رہی تھی جس کے ثبوت میں اتنا عرض کر دینا کافی ہوگا کہ مسلمانوں میں پہلے گریجویٹ مرزا محمد عسکری ادیب تھے۔ لکھنؤ کی سوسائٹی میں تفرقہ پڑ چکا تھا اس لئے برادران ہنود بہت جلد اس اصول کے تحت کہ لوگ اپنے بادشاہوں کے دین پر ہوتے ہیں، انگریزی تعلیم اور انگریزوں کی ملازمت پر آمادہ ہوگئے تھے۔ ہندوؤں کا نئی تہذیب کی طرف اقدام اور مسلمانوں کا احتراز ان دونوں فرقوں میں تلخیاں پیدا ہونے کا ایک سبب بن گیا تھا۔ بہرحال انگریزوں کا بول بالا رہا اور قدیم معاشرت کو اندر اندر ایسا گھن لگا کہ اس کا خاتمہ ہوگیا۔

ناانصافی ہوگی اگر ہم اس مقام پر انگریزوں کی اس حکمت عملی کے فوائد کو نظرانداز کر دیں۔ اس ذیل میں سب سے بڑا فائدہ یہ ہوا تھا کہ اس معاشرت کا جو مائل بہ زوال و انحطاط تھی، لکھنؤ والوں کو ایک بدل مل گیا۔ ان لوگوں کو مغربی تہذیب میں روحانی سکون اور لذت کی نعمتیں حاصل ہوئیں یا نہیں، یہ ایک علیٰحدہ بحث ہے اور ہمارے موضوع سے خارج ہے لیکن اتنا تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ ہمارے ہاتھ سے ایک دولت گئی تھی تو دوسرا بدل مل گیا تھا۔ لوگوں کے تفکر و تعقل کو ایک موڑ ملا تھا جہاں کھڑے ہوکر نئے راستوں کی جستجو کی جاسکتی تھی۔ آبادی کا بہت بڑا حصہ اپنے معاش کا وسیلہ ملازمت کو بنائے تھا۔ رؤسا و عمائدین میں ملازم رکھنے کی استطاعت تیزی سے گر رہی تھی۔ لوگوں کو سرکاری ملازمتوں کا سہارا ملا جو یقیناً نئے طرز کی تھی لیکن جدیدیت میں لذت حاصل ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ اسی ملازمت کے علاوہ اور کوئی چارہ بھی نہیں تھا۔ مولانا علی نقی صفیؔ مرحوم کو بھی جن کے خاندان کو برس ہا برس سے نواب سلیمان قدر بہادر کی ڈیوڑھی میں تقرب حاصل تھا، انگریزوں کی نوکری قبول کرنا پڑی تھی جو نئی نسل اس وقت پیدا ہو رہی تھی وہ اور تیزی کے ساتھ مغربی تہذیب کی گرویدہ ہوکر اپنے آباء و اجداد کے مسلک کو خیرباد کہنے پر آمادہ ہوگئی تھی کیونکہ پرانے نظام میں کوئی مستقبل باقی نہیں رہ گیا تھا۔ اس معاشی اور اقتصادی کشمکش میں جدید مذاق کو شرف قبول حاصل ہوا اور رفتہ رفتہ تمام پرانی تہذیب کے رسم و رواج اور طور طریقے ختم ہوگئے۔ لکھنؤ کے معاشرہ نے اپنے تمام حسن و جمال سمیت دم توڑ دیا اور مغربی تہذیب اس پر غالب آگئی لیکن یہ کہنا بھی صحیح نہ ہوگا کہ اس انقلاب عظیم میں پرانی گراں بہا قدروں کی پامالی صرف انگریزوں کی پالیسی کی وجہ سے آئی تھی بلکہ اس تباہی و بربادی میں ہمارے امراء و شرفا کی بھی بہت بڑی ذمہ داری تھی جس کا تذکرہ آئندہ آئے گا۔

❑❑❑

اردو زبان کا سیکولر کردار

دوسری زبانوں کے مقابلے اردو میں سیکولرزم کی پختہ روایت پر **پروفیسر مشیر الحسن** کا مقالہ

اردو کے مشہور و معروف شاعر **انور جلالپوری** کی شخصیت اور فن پر **وسیم بریلوی، نواز دیوبندی، منور رانا، خوشبیر سنگھ شادؔ، سنجئے مصرا شوق، شفیع جاوید** وغیرہ کے مضامین کے علاوہ **بھگوت گیتا** کے منظوم ترجمہ کے اقتباسات، اردو ادب میں اتر پردیش کے غیر مسلم ناول نگاروں کی خدمات پر **نعمان قیصر** کا مضمون

فارسی ادب میں ہندو شعراء کی خدمات پر **ڈاکٹر سعدیہ جعفری** کا مضمون

مئی ۲۰۱۸ء کا 'نیا دور' اردو زبان کے انہیں اوصاف پر مبنی ہوگا

امّائیں

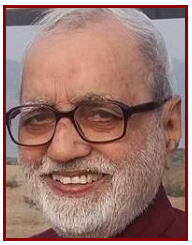

دودھ ناتھ سنگھ

ہندی کے معروف شاعر، نقاد اور افسانہ نگار، دو درجن سے زائد کتابوں کے مصنف، مختلف اعزازات سے سرفراز
پیدائش: ۱۷؍اکتوبر ۱۹۳۶
وفات: ۱۲؍جنوری ۲۰۱۸ء

اسرار گاندھی

مشہور افسانہ نگار، چار افسانوی مجموعے اردو اور ایک ہندی زبان میں شائع
وطن الٰہ آباد، دودھ ناتھ سنگھ کی اس ہندی کہانی کے مترجم

18E/11J/6D، کرامت کی چوکی، الٰہ آباد
موبائل: 9335152371

وہ بڑا سا ہرا درخت...... جیسے وہ پوری زمین پر تنہا تھا اور دور دور تک جہاں تک نظریں جاتیں، زمین پھٹی ہوئی تھی۔ اس میں بڑی بڑی دراریں تھیں۔ صرف چٹیل میدان تھا جس میں کہیں کہیں مٹمیلی سی، چھوٹی چھوٹی سی بستیاں تھیں۔ مٹی کے بکھرے ہوئے سے چند کھنڈر جو ہمارے رجسٹر میں درج تھے۔ ان بڑے اور سوکھے میدانوں میں کسانوں نے اپنے جانور چھوڑ دئے تھے۔ چلچلاتی ہوئی دھوپ کے اس سناٹے میں ہڈیوں کے ہلتے کانپتے ہوئے جھنڈ اچانک سے نظر آجاتے تھے جو نہ جانے کدھر اور کہاں دبی چھپی گھانس کی ہری ہری پتیاں ڈھونڈنے کی کوشش کرتے ہوئے تھوتھن لٹکائے ہوئے ادھر ادھر گھوم رہے تھے۔ ہماری جیپ دھول اڑاتی ہوئی اس چھتنار پیڑ کی جانب بڑھ رہی تھی۔ اس کے پاس ہی تین چار گھروں کا ایک کھنڈر تھا۔ ہم نے وہاں پہنچ کر جیپ روکی اور نیچے اتر کر کھڑے ہو گئے۔ کھنڈر سے چھ سات بچے شور مچاتے ہوئے نکلے اور ہمیں دیکھتے ہی اندر بھاگ گئے۔ ہم سمجھے کی وہ کپڑے پہننے گئے ہوں گے کیونکہ وہ سبھی نیم برہنہ سے تھے۔ اتنی سخت گرمی ہے اور ہوا ٹھہری ہوئی ہے۔ ان کھلے اور تپتے میدانوں میں گویا کپڑے بدن پر کاٹتے ہیں۔ یہی ہم نے سوچا اور بچوں کے باہر آنے کا انتظار کرنے لگے اور پاکڑ کا یہ تناور درخت۔ وہ ان حالات میں کیسے نمی کشید کر کے اتنا بڑا ہو گیا تھا کیونکہ گزشتہ چھ سات سالوں میں بندیل کھنڈ میں ایک قطرہ بھی بارش نہیں ہوئی تھی۔ لوگ بتاتے تھے کہ اتنا بڑا قحط تو ان کے ہوش میں کبھی نہیں پڑا تھا۔ باغ باغیچہ، بسواریاں حتیٰ کہ چھپر بنانے والے کھر پتوار بھی راکھ ہو چکے تھے اور اب ان کے دوبارہ اگنے کی کوئی امید بھی نہیں ہے کیونکہ زیر زمین آب کا ذخیرہ ہی ختم ہو چکا ہے۔

اسی آن مردم شماری کا وقت آگیا تھا۔

ہمیں اس علاقہ کی تعداد رجسٹر میں درج کرنا تھی۔ فارم میں مختلف کالم تھے۔ ہماری جیپ ایک بستی سے دوسری بستی تو ایک کھنڈر سے دوسرے کھنڈر رواں تھی۔ لوگ جیپ کی گھر۔۔۔۔۔ گھر۔۔۔۔ سنتے ہی گھروں سے بھاگ جاتے۔ ہم تقریباً ایک مہینے سے اسی سمت تھے۔ ہمیں کیا اور کیسے بولنا تھا، رٹ گیا تھا۔

نام؟

پتا کا نام؟

کیونکہ ہمارے ایک کارکن نے 'باپ کا نام' بولا تھا تو کافی زدوکوب کا شکار ہوا تھا۔ 'باپ' بولتا ہے؟ اور وہ آدمی چڑھ بیٹھا تھا۔ معاملہ بیچ بچاؤ سے نپٹایا گیا پھر سارے مرد گاؤں چھوڑ کر بھاگ گئے تھے۔ سرکاری لوگ ہیں۔ پولیس آسکتی ہے۔ تب سے ہم 'باپ' کی جگہ پتا' کا نام پوچھنے لگے تھے۔

پتہ؟

ساکن موضع؟

بچے کتنے؟

بچوں کا کیا کروگے؟ وہ آدمی شیر کی طرح چوکنا ہوگیا تھا۔

پیشہ؟ یعنی کیا کرتے ہو؟

عمر؟ کتنی؟

آنکھوں میں کشمکش سی نظر آرہی تھی۔

صحیح صحیح بتانا۔ چھپانا مت۔ تمہارا نام اس رجسٹر میں درج ہوگا تبھی کچھ ہو پائے گا۔

کیا سب کچھ ہوگا؟ چہرہ پر سوالیہ نشان جیسے تاثرات تھے۔

اگر نہیں تو تم کہاں کے باشندے ہو؟ تمہارے اجداد کون تھے؟ تمہاری زمینیں؟ خود کاشت؟ بھومی دھری؟ بٹائی؟ ادھیا؟

کچھ پتہ نہیں چلے گا۔

پولیس تمہیں دھرلے گی۔

تم چور ڈکیٹ، خونی۔ چمبل کے بیہڑوں میں آوارگی کرنے والے۔

تمہارے اوپر کوئی بھی الزام آسکتا ہے۔

تم حوالات میں، جیل میں، پولیس کے ڈنڈے کے نیچے۔

یہ خبر آگ کی طرح پھیلی۔

نتیجہ۔۔۔۔۔ سارے مرد غائب۔

اگر اس حادثہ کی شکایت ہوگئی تو ہم نپ جائیں گے۔ ایک کلرک کے منہ سے نکلا۔

بیٹھنے کی کوئی اور جگہ نہیں تھی۔ صرف اس پیڑ کے گھنے سایہ میں سکون میسر تھا جو ایک ناقابل یقین خواب سا تھا۔

ہم نے اپنی بڑی سی سفید دری نکالی اور چاروں لوگوں نے کونا پکڑ کر اسے ریت پر بچھایا۔ وہاں چیونٹیوں کے بڑے بڑے بل تھے۔ دھول ہلکی سی گرم تھی اور چاروں طرف ایک گرم سا سناٹا۔

ہمارا چپراسی اس مٹی کے کھنڈر تک گیا۔

سامنے کا نیم شکستہ دروازہ بند تھا۔ ادھر سے چھوٹے چھوٹے برہنہ بچے نکل کر جھانکتے اور اندر بھاگ جاتے۔

اندر کون کون ہے؟ باہر نکلو اور نام پتہ بتاؤ۔ چپراسی نے اس دروازے کے پاس جا کر ہانک لگائی۔

اے.... اندر کون کون ہے؟ چپراسی کی آواز پہلے سے بلند ہوچکی تھی۔

بچوں کا ایک گروہ پھر اس ٹوٹے سے گھر سے برآمد ہوا۔ 'ہماری امائیں ہیں اور کوئی نہیں ہے۔' ایک بچے نے ہمت دکھائی۔

اب وہ سبھی کھنڈر کی شکستہ دیواروں پر چڑھ کر کھڑے ہوگئے۔

اپنی اماؤں سے بولو کہ باہر آکر نام پتہ لکھائیں۔ بولنا کہ ڈریں نہیں۔ ہم لوگ سرکاری آدمی ہیں۔ چپراسی کے بولنے کا انداز کچھ ایسا تھا کہ وہ چاہ رہا تھا کہ اندر بیٹھی عورتوں تک اس کی آواز پہنچ جائے۔

'اندر کتنی امائیں ہیں؟' چپراسی نے سوال کیا۔

ایک بچے نے ہاتھ کے پنجے کی تین انگلیاں دکھائیں، دوسرے نے چار تو تیسرے نے پورا پنجہ۔ پھر وہ کھل کھل کرتے اندر بھاگ گئے۔

'بڑا چکر ہے صاحب! اور مرد کوئی دکھ ہی نہیں رہا ہے۔' چپراسی پسینہ سے تربتر تھا۔

'بچے کھیل کر رہے ہیں۔ شاید اندر کوئی نہیں ہے۔' میں نے کہا۔

'اندر کوئی نہیں ہوگا تو اتنے بچے کہاں سے آگئے۔' گویا چپراسی کو میری نادانی پر ترس آگیا تھا۔

'آگے بڑھتے ہیں۔' کسی نے کہا۔

'لیکن یہ کھنڈر درج ہے۔ صاحب! چھوٹ جائے گا۔' کارکن نے فہرست چیک کی۔

'چھوٹ جائے گا تو کون سی آبادی میں کمی ہو جائے گی۔' سبھی لوگ ایک ساتھ ہنس پڑے۔

'سب ننگے تھے۔ بچوں کے بارے میں۔

'چرکٹ بھی نہیں تھا۔' چپراسی نے کہا۔

'کتنی گرمی ہے؟'

پھر بھی صاحب! اس طرح ننگا تھوڑے کوئی رہے گا۔

دماغ عجیب فتوری چیز ہے۔ باہر کچھ ہوتا رہتا ہے اور اندر کچھ اور چلتا رہتا ہے۔ جتنی مرتبہ بچے نکلے، چاہے وہ گروہ میں ہوں یا تنہا۔ سبھی مکمل برہنہ تھے۔ تو اندر چل کیا رہا ہے۔ عورتیں باہر کیوں نہیں آرہی ہیں۔ اور مرد لوگ؟ وہ اس ویرانے میں اس بے سہارا آبادی کو تنہا چھوڑ کر کہاں چلے گئے ہیں۔ جب یہ واقعہ ہوا تو میں گڑگاؤں کے مال میں ٹہل رہا تھا۔ چاروں جانب کپڑوں کے ڈھیر۔ کوئی اپنی بیوی سے کہہ رہا تھا، 'اس میں چلتے چلتے تھک جاؤ گی۔ ایک ڈیڑھ کلومیٹر لمبا ہے۔ جو خریدنا ہے یہیں سے لے لو' اتنے سارے کپڑے، مختلف ڈزائن اور سائز کے۔ کپڑوں کے اس گلیارے میں یہاں سے نہ جانے کہاں تک۔ جئے پور ہائیوے کے برابر تک۔ میں نے کانچ کی چمکتی ہوئی بڑی سی دیوار کی دوسری جانب دیکھا۔ اتنے رنگ ایک ساتھ موجود تھے اور اتنی سہانی سردی جیسے میں شملہ کے مال کے زینوں سے نیچے اتر کر ونڈو شاپنگ کر رہا ہوں، کچھ خرید نہیں رہا لیکن جیمس بانڈ کی طرح اپنے اوور کوٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے میری چہل قدمی پر کسی کو بھی اعتراض نہیں ہے لیکن سبھی کے چہروں پر ہلکی سی مسکراہٹ ضرور ہے۔ بالکل اسی طرح میری روح

وہاں دور تک سجے کپڑے کے بازار میں ٹہل رہی تھی جب کہ میں وہیں تھا۔ اس پیڑ کے نیچے تپتی ریت پر اپنے کارکنوں کے ساتھ بیٹھا ہوا، ایک کھنڈر کا سامنا کرتے ہوئے جس کے اندر شاید ایک خاموش کھلبلی موجود تھی۔

اسی طرح۔۔۔۔ بالکل اسی طرح جب ان بچوں نے کہا: امائیں ہیں اور کوئی نہیں ہے تو وہاں بیٹھے بیٹھے تو مجھے اپنی ماں کے بارے میں خیال آیا جو بلاوجہ اور معمولی گھریلو فساد پر غصہ ہوکر کنویں میں ڈوب مریں۔

تبھی اچانک سامنے کا دروازہ کھلا۔ ایک تندرست سی عورت، ایک چمکیلی سی ساڑی کی بہت سی سلوٹوں کو ہاتھ سے صحیح کرنے کی کوشش کرتے ہوئے باہر نکلی۔ ہم سبھی اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ نہیں، کسی دہشت سے نہیں بلکہ اس کے اس طرح اچانک نمودار ہونے پر۔ ادھر کھنڈر پر سارے برہنہ بچے نکل کر چپ چاپ کھڑے ہو گئے جیسے کوئی برا حادثہ ہونے کو ہو۔ چپراسی جو پھر آواز لگانے ہی والا تھا، سہما سا کچھ فاصلہ سے اس کے پیچھے چل رہا تھا۔

'ہاں پوچھئے' اس عورت نے نہایت ہی نرم لہجہ اور سپاٹ آواز میں پوچھا۔

'آپ کا نام؟'

'نہیں معلوم' عورت نے ہاتھوں سے انکار کیا۔

'آپ کے شوہر کا نام؟'

'نہیں لیتے'

کارکن مسکرایا۔

'کوئی عورت ادھر نہیں رہتی' ایک کلرک نے کہا

'کہاں ہیں آپ کے شوہر؟'

'پتہ نہیں'

'آپ لوگ تنہا رہتے ہیں یہاں؟'

'نہیں تو' عورت نے بچوں کی طرف نظر دوڑائی۔

'یہ آپ کے بچے ہیں؟'

'نہیں، ہم تینوں کے'

'اندر تین امائیں ہونگی صاحب!' چپراسی نے کہا۔

عورت نے چپراسی کی طرف دیکھا۔

'تو انہیں بھی بلایئے'

'تھوڑی دیر لگے گی' عورت نے کہا۔

'کیوں؟ دیر کیوں لگے گی؟' مجھے تھوڑا سا غصہ آرہا تھا۔ چیونٹیاں نہ جانے کس طرف سے دری پر چڑھ آئیں تھیں اور ادھر ادھر بھاگ رہی تھیں۔

'کیوں دیر لگے گی؟' میں نے ایک چیونٹی کو مسلتے ہوئے پوچھا۔

'نہیں بتا سکتے' عورت نے کہا۔

'کیوں۔۔۔۔۔ کیوں کیوں؟'

'نہیں بتا سکتے' عورت نے پھر دہرایا

'تو مت بتایئے۔ ان لوگوں کو بھیجئے' میرا غصہ بھڑک رہا تھا۔

'تھوڑی دیر لگے گی؟'

'پھر وہی بات' میں بپھر پڑا۔

'حضور! ننگی تو نہیں آسکتیں۔ وہ تو بچے ہیں' اس نے کھنڈر کی دیواروں پر کھڑے بچوں کی سمت دیکھا۔

'میں جاؤں گی۔ ساڑی اتاروں گی۔ تب نا، ساڑی باندھنے میں تھوڑی دیر تو لگ ہی جائے گی' عورت مڑی اور اس نیم شکستہ دروازے کے اندر گم ہوگئی۔

پھر دروازے کے بند ہونے کے آواز ہوئی۔

ہم نے پلٹ کر ادھر دیکھا۔

ہم سب کا منھ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ ہم سب نے ایک ہی تصور کیا تھا۔ امائیں اور بچے۔ اس صورت حال کے تصور ہی سے ہماری آنکھیں پھٹی رہ گئیں۔ ہمارا چپراسی کچھ بول رہا تھا۔ 'وہ دوسری تیسری بھی کچھ نہیں بولیں گی صاحب! تو کیا ضرورت ہے صاحب! کچھ بھی لکھ لیجئے صاحب! تین امائیں اور بچے پتہ نہیں، سات آٹھ کہ نو اور ان کے آدمی؟' چپراسی نے چلچلاتی دھوپ کی دھند میں دیکھا۔ 'یہاں سے بھاگئے صاحب'

میں نے گھبرا کر چاروں جانب دیکھا اور بنجر زمین پر نظریں گڑا دیں۔ ادھر مرے سے جانوروں کا ایک جھنڈ ہلتا کانپتا نہ جانے کدھر کو بڑھا چلا جا رہا تھا۔

ایک ہیجان آمیز سناٹا۔ سب کچھ بے آواز۔

❑❑❑

'نیا دور' کو ایسی ادبی تخلیقات کا شدت سے انتظار ہے جو نہ صرف دلچسپ بلکہ معلوماتی بھی ہوں۔ ایسی تخلیقات جو اعلیٰ درجے کے ادبی شہ پاروں کی حیثیت رکھتی ہیں مگر عام قاری کی دلچسپی سے عاری ہوں تو اسے 'نیا دور' اپنی اشاعتی ترجیحات میں شامل کرنے سے گریز کرے گا کیونکہ معاملہ دراصل اردو کے فروغ کا ہے۔ اردو محض یونیورسٹیوں کے شعبوں، تحقیقی اداروں اور دیگر اردو مراکز تک اپنی مخصوص ضرورتوں کے تحت محدود رہے، اس روش سے بہرحال پرہیز کرنا وقت کی اہم ترین ضرورت ہے۔ ہم سب کا اولین فریضہ ہے کہ اردو زبان کے فروغ میں پوری تندہی کے ساتھ شامل رہیں اور عام قاری سے اردو کے مراسم کو استوار کرنے کا کوئی بھی موقع ہاتھ سے نہ جانے دیں۔ تخلیق کا غیر مطبوعہ ہونا لازمی شرط ہے۔ تخلیق کے ساتھ اپنی تصویر، ٹکٹ لگا ہوا لفافہ معہ پتہ اور بینک اکاؤنٹ نمبر، آئی۔ایف۔ایس۔سی۔، برانچ کوڈ والا Cancelled Cheque بھی ضرور ارسال کریں۔ **بغیر بینک تفصیلات کے حاصل ہونے والی تخلیقات کسی بھی صورت میں شائع نہیں کی جائیں گی کیونکہ اس کے سبب ہی دیگر تخلیق کاروں کے اعزازیہ میں غیر ضروری تاخیر ہوتی ہے۔**

مروّت

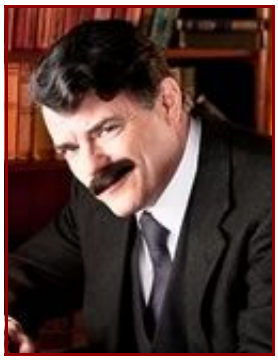

اسٹیفن لیکاک

بیسویں صدی کے ابتدائی دور کے بہترین مزاح نگار سیاسی مفکر، ادیب، خطیب اور سائنسداں، لیکاک کی مزاح میں ڈوبی ہوئی کہانیاں بیحد مقبول ہوئیں

پیدائش: ۳۰ر دسمبر ۱۸۶۹ء

وفات: ۲۸ر مارچ ۱۹۴۴ء

ان کی اس کہانی کا ترجمہ **رائحہ تقوی** نے کیا ہے۔

میں اور آپ تو خیر باتوں کے دھنی ہیں لیکن کچھ لوگ منہ میں زبان رکھتے ہوئے بھی اپنی منشا بیان نہیں کر پاتے۔ ان کے لئے فون پر باتیں ختم کرنا اور دوستوں کو الوداع کہنا بہت مشکل ہوتا ہے۔ محفل میں جب رخصت کا وقت قریب آتا ہے اور مہمان اجازت لینے کے لئے اپنی جگہ سے ایک دم اٹھ کر کہتا ہے:

'اچھا، میرے خیال میں اب مجھے....'

اس پر میزبان کے جملے بھی رسمی ہی ہوتے ہیں:

'ارے..... آپ ابھی تو آئے ہیں۔ اتنی بھی کیا جلدی ہے؟'

یہاں سے ایک دردناک داستان کا آغاز ہوتا ہے:

اسی طرح کی ایک افسوس ناک مثال میرے علم میں بھی ہے۔ اس حادثہ کا تعلق میرے ایک خاص دوست سے ہے جس نے زندگی کی صرف ۲۳ بہاریں دیکھی تھیں۔ مذہبی قسم کا انسان، غرور و تکبر سے پاک، باتمیز یعنی شرافت کا نمونہ۔ ہوا یوں کہ ادھر گرمیوں کی چھٹیاں شروع ہوئیں اور ادھر وہ اپنے ایک عزیز کے دولت کدہ کی طرف چل پڑا۔ جب بہار آئی تو بیابان کی جانب رخ کر لیا۔ گویا آئندہ چھ ہفتوں کے لئے وہ بیکار سا ہو کے رہ گیا۔

وہاں کچھ دیر اس نے باہمی دلچسپی کی بات کی۔ دو کپ چائے پی، اس کے بعد روانگی کے لئے سوچا اور اچانک کہا:

'اچھا، میرے خیال میں اب مجھے....'

لیکن میزبان خاتون نے جواباً کہا:

ارے..... ابھی نہیں جونز! کیا تم کچھ دیر اور نہیں ٹھہر سکے۔

جونز ٹھہر اصاف گو انسان، بولا:

جی ہاں! یقیناً میں..... بالکل ٹھہر سکتا ہوں۔

پھر تو وہ واقعی ٹھہر گیا اور اس نے یکے بعد دیگرے گیارہ کپ چائے پی۔

'میرے خیال میں اب مجھے واقعی۔۔۔۔'

شام آہستہ آہستہ رات سے مل رہی تھی۔ وہ دوبارہ اٹھ کھڑا ہوا اور قدرے شرماتے ہوئے بولا:

'کیا تم واقعی جانا چاہتے ہو؟ میرے خیال تھا کہ تم رات کے کھانے تک رکو گے۔' میزبان کی آواز میں شگفتگی تھی۔

'اچھا! میں رک جاتا ہوں، اگر.....'

'پھر تو برائے مہربانی رک ہی جاؤ۔ مجھے یقین ہے کہ میرے شوہر بہت خوش ہوں گے۔'

ٹھیک ہے! پھر تو رکنا ہی پڑے گا۔' اس نے نحیف آواز میں کہا۔'

وہ دوبارہ کرسی پر ڈھیر ہو گیا۔ وہ چائے اور بے چینی سے لبریز ہو چکا تھا۔

شوہر کی واپسی پر دسترخوان چنا گیا۔ کھانے کے دوران بھی وہ خیالی پکاؤ پکاتا رہا کہ وہ ساڑھے آٹھ بجے تک حتماً روانہ ہو جائے گا۔ ادھر وہ دونوں سوچ رہے تھے کہ جونز کم عقل اور خاموش طبع ہے یا صرف کم عقل۔

کھانے کے بعد خاتون نے جونز کو خاندانی بیش قیمتی اشیاء اور تصویریں دکھائیں۔ صاحب اور ان کی بیوی کی تصویر، بیوی کے بھائی اور ان کے ایک چھوٹے بچے کی تصویر۔ صاحب کے دوست کی بنگالی یونیفارم میں ایک دلچسپ اور رعب دار تصویر، صاحب کے دادا کے دوست کے کتے کی ایک دہشت ناک تصویر.... روانگی کے وقت صاحب کے لباس کی تصویر۔ غرض کہ ساڑھے آٹھ بجے تک جونز اکہتر تصویریں دیکھ چکا تھا اور ابھی بہت سی تصویریں دیکھنا باقی تھیں۔

جونز اٹھ کھڑا ہوا اور گزارش کی:

'اب مجھے اجازت دیجئے۔'

'اجازت؟ ابھی تو ساڑھے آٹھ ہی بجے ہیں۔ کیا تمہیں کوئی کام کرنا ہے؟'

'بالکل نہیں.....' اس نے انکار کیا، زیر لب کچھ بڑبڑایا اور ایک زوردار قہقہہ لگایا۔

پھر اچانک ایک حادثہ ہو گیا۔ گھر کے سب سے لاڈلے بچے نے جونز کا ہیٹ چھپا دیا۔ اس پر صاحب نے کہا کہ اب تو اسے ٹھہر ہی جانا چاہئے۔ صاحب نے سگار پیش کی اور گپیں مارنے لگے۔ ان سب چیزوں کے بعد ابھی تک وہ بھی وہاں موجود تھا۔

اسے ہر لحہ فرار ہونے کا خیال آتا رہا لیکن فرار ہونے کی ہمت نہ ہوئی۔ اتنی دیر میں صاحب بیزار ہو چکے تھے۔ آخر اکتا کر انہوں نے طنز کسا کہ مناسب یہی ہے کہ جونز ساری رات یہیں قیام کرے اور وہ اسے سونے کے لئے ایک بوریا دے سکتا ہے۔

جونز ان کے طنز میں پوشیدہ اصلی مطلب کو سمجھنے سے قاصر رہا اور نم آنکھوں سے شکریہ ادا کرنے لگا۔ صاحب نے اسے ایک معمولی کمرے میں سلا دیا اور دل ہی دل میں لعنت ملامت کرتے رہے۔

دوسرے دن ناشتے کے بعد صاحب تو دفتر چلے گئے اور مایوس سے جونز کو ایک بچے کے ساتھ کھیلتا ہوا چھوڑ گئے۔ اس کا جسم جواب دے چکا تھا۔ وہ پورے دن فرار ہونے کا ارادہ ہی کرتا رہا لیکن کسی چیز نے اس کو جکڑ رکھا تھا اور اس کی ہمت جواب دے چکی تھی۔

شام کو صاحب واپس آئے اور جونز کو دیکھتے ہی پریشان ہو گئے۔ انہوں نے ہنسی مذاق میں جونز کو ٹھکانے لگانے کا منصوبہ بنایا اور ہنستے ہوئے کہا:

میرا خیال ہے کہ مجھے تم سے رہائش کا کرایہ لینا پڑے گا۔ ہاہاہا۔

جونز پہلے ہی پریشان تھا۔ وہ ایک لحہ کے لئے دہشت زدہ ہو گیا لیکن پھر خود کو سنبھالتے ہی اس نے صاحب کا ہاتھ زور سے دباتے ہوئے ایک ماہ کے کرایہ کی پیشگی رقم سونپ دی اور بچوں کی طرح سسکیاں بھرتے ہوئے رونے لگا۔

دن گزرتے گئے۔ وہ غمگین اور گوشہ نشین ہوتا گیا۔ اس دوران وہ ڈرائنگ روم ہی میں رہتا تھا۔ تازہ ہوا کی کمی سے اس کی صحت پر برا اثر ہوا تھا۔ اس نے چائے پینے اور تصویریں دیکھنے میں وقت گزارا۔ اب وہ گھنٹوں کھڑے ہو کر وہ صاحب کے دوست کی بنگالی یونیفارم کی تصویریں دیکھ سکتا تھا۔ ان سے باتیں کر سکتا تھا اور کبھی کبھی ان کی شان میں گستاخی بھی کرتا تھا۔ اس کا ذہنی توازن بگڑتا جا رہا تھا۔

آخر ان سب چیزوں کا اثر ظاہر ہونے لگا۔ اسے سنگین بخار کی وجہ سے بالائی منزل کی طرف بھیج دیا گیا۔ وہ بوکھلا چکا تھا۔ وہ کسی کو پہچان نہیں پا رہا تھا حتیٰ کہ صاحب کے دوست کی بنگالی یونیفارم کی تصویر کو بھی۔ وہ اچانک بستر سے اٹھ کر بیٹھتا اور چلاتا:

'اچھا، میرے خیال میں اب مجھے۔۔۔۔'

اور پھر ایک زوردار قہقہہ فضا میں گونجتا اور وہ ہنستے ہنستے بستر پر الٹ جاتا پھر اچانک دوبارہ اچھل کر بیٹھ جاتا اور چیختا:

ایک کپ چائے اور کچھ اور تصویریں، ہاں ہاں، کچھ اور تصویریں۔

جونز ایک مہینہ اسی حالت میں رہا اور گرمیوں کی چھٹیوں کا آخری دن اس کی روح و جسم کے ہجر کا دن تھا۔ گھر والوں نے بتایا کہ آخری وقت میں وہ بستر پر اٹھ کر بیٹھ گیا۔ چہرے پر ایک سنجیدہ مسکراہٹ سجی تھی، بولا:

مجھے فرشتے آواز دے رہے ہیں۔ افسوس! اب مجھے واقعی جانا پڑے گا۔ الوداع۔

اس کی روح جسم سے یوں پرواز کی جیسے کوئی قیدی بلی باغ کی دیواروں کو عبور کر کے فرار ہوتی ہے۔

❑❑❑

ایندھن

حمید دلوائی

مراٹھی زبان کے مقبول ادیب انگریزی میں بھی چند کتابیں شائع ہندوستانی مسلمانوں کے تہذیبی اور سماجی مسائل پر مختلف مضامین شائع

پیدائش: ۲۹ ستمبر ۱۹۳۲ء

وفات: ۳ مئی ۱۹۷۷ء

ایندھن کی آخری قسط

اسٹیٹ ٹرانسپورٹ کی بس بمبئی سے گوا جانے والی زیرتعمیر سڑک کے پکے حصے پر دوڑ رہی تھی۔ آدھے گھنٹے بعد کچی سڑک آ گئی۔ اب وہ ہانپتے ہوئے پرشورام کی گھاٹی پر چڑھنے لگی۔ بس میں بیٹھے مسافر اونگھ رہے تھے۔ جنارد ھن کو بھی نیند آنے لگی۔ انجن کی متواتر اور کرخت گھرر گھر کا نشہ مجھ پر بھی طاری ہونے لگا اور میرے ذہن میں ہم سب کے مستقبل کی زندگی کا نقشہ بننے لگا۔

بنئے کی بیوی، جنارد ھن، سمتی، بھائی، سدام، اس کی بہو، دھوپن، لکشمی.... ان سب کی زندگی کو میں نے قریب سے دیکھا تھا اور وہ جس طرح جیتے اور برتاؤ کرتے تھے، اسی طرح سے ان کی آئندہ زندگی گزرنے والی تھی۔

میں نے ان سب کو مارشلنگ یارڈ کی پٹریوں پر شنٹ کئے جاتے مال گاڑی کے ڈبوں کی طرح دیکھا، الگ الگ سمتوں سے آتے ہوئے، گھڑگھڑا کر آگے بڑھتے اور ایک طے شدہ مقام پر پھر الگ ہو کر کسی اور طے شدہ مقام پر پہنچتے ہوئے...

جنارد ھن کے قصبہ چھوڑ جانے کی خبر پاتے ہی بنئے کی بیوی کو بہت دکھ ہوگا۔

اس نے جنارد ھن کے بارے میں غلط تصورات باندھے تھے۔ وہ سمجھتی تھی کہ اس کی بے بسی اور اکیلے پن کا وہ ناجائز فائدہ اٹھا رہا ہے اور اس بات پر وہ اندر ہی اندر اس سے نفرت کرتی تھی۔ اس کے باوجود وہ ناچار اس سے کچھ دیر رک جانے کی منت بھی کیا کرتی۔

اس نے کئی بار اپنے شوہر سے اپنی اس بے بسی کا اظہار کیا تھا لیکن اس نے ہنس کر اڑا دیا تھا۔ اس کے خیال میں جنارد ھن سیدھے سبھاؤ کا آدمی تھا، اور وہ اپنا یہ خیال بدلنے کو تیار نہ تھا۔

لیکن بنئے کی بیوی کو یہ بات تسلیم نہ تھی۔ جنارد ھن سے کترانے کے لئے ہی تو وہ اپنی دکان کے پاس پالکی کے جلوس سے نکل کر آ گئی تھی۔ بنیا دکان کے دروازے میں ہی بیٹھا تھا۔ اسے تیوہار منانے کا کچھ خاص شوق نہ تھا اور قصبے کی اس مقامی دیوی سے اسے کوئی لگاؤ بھی نہ تھا۔ اپنی بیوی کو جلوس سے نکل کر واپس آتے دیکھ اسے کوئی حیرت نہ ہوئی۔ اسے خریداری کے لئے بازار جانا تھا۔ وہ نکلنے کا سوچ ہی رہا تھا۔ اس کی بیوی نے اسے روکنے کی کوشش نہ کی۔ اب وہ آفت ٹل چکی تھی۔

پھر گرمی پہلے سے کہیں زیادہ شدت سے محسوس ہونے لگے گی۔ بوائی کا وقت قریب آ جائے گا۔ آسمان میں تمام دن بادل تیرنے لگیں گے۔ وہ زمین کی بھاپ کو بیچ ہی میں روک لیں گے اور گرمی سے لوگوں کا جی گھبرانے لگے گا۔ برسات کو نزدیک پاکر لوگ لکڑیاں کاٹنے، بازار سے سودا لاکر گھر میں رکھنے اور طویلوں کے فرش تیار کرنے جیسے سب کام جلدی ہی نمٹانے لگیں گے۔ جلد ہی دھان کی بوائی کی تیاری شروع ہوجائے گی۔

بودھ رفتہ رفتہ مسلمانوں کے محلے میں کام پر آنے لگیں گے۔ نائی اپنا بلونا وصول کرنے کے لئے زمینداروں کے گھروں میں جھانکنے لگیں گے اور ان کی حجامت کا کام پھر شروع کردیں گے۔ ہر بار راؤ ہچکچاتا ہوا پھر قادر خان کی دکان پر آکر بیٹھنے لگے گا لیکن مسلمانوں کو خیال آئے گا کہ صرف دھوبن ہے جو اب تک وہاں نہیں آ رہی۔ اور وہ کہیں گے،

'اس کو اب تک کس چیز کا غصہ ہے، یہ سمجھ میں نہیں آتا۔ اس رانڈ سے کہنا، سامنے کھانا ہوتے ہوئے بھی کیوں بھوکوں مرنا چاہتی ہے۔ دھلائی کا کام کرے اور اپنے دام لے۔' دو چار لوگ اسے بلاوا بھی بھیجیں گے۔ وہ جواب بھجوائے گی کہ آتی ہوں لیکن آنے کی ہمت نہیں کر پائے گی۔

وہ زمینداروں سے ڈرتی رہے گی۔ اس رات کے تجربے سے وہ اب سنبھل نہیں پائی ہوگی۔ وہ لوگ کون تھے، یہ وہ اب تک نہیں جان پائی ہوگی۔ وہ اس پر ٹڈی دل کی طرح حملہ آور ہوئے تھے۔ اس زور زبردستی اور کھینچا تانی سے اس کے حواس اب تک بحال نہیں ہوئے ہوں گے۔ مسلمانوں کے محلے میں جانے کے لئے اس کا دل آمادہ نہیں ہوگا لیکن یہ سن کر کہ بودھ اور نائی وہاں جانے لگے ہیں، اسے بھی وہاں جانے کا خیال آئے گا۔ ایک دن وہ اٹھ کر سیدھے نائی واڑے کو پار کر کے مسلمانوں کے محلے کی طرف جانے لگے گی۔

راستے میں نائنیں اپنے آنگنوں میں بیٹھی دکھائی دیں گے۔ وہ کچھ دیر رکے گی، ان سے رسمی حال احوال کے چار لفظ بولے گی۔ کوئی اس سے پوچھے گا، 'کہاں جارہی ہو؟'

'بلونا وصول کرنے' وہ جواب دے کر ان عورتوں کی طرف دیکھنے لگے گی لیکن ان کے چہروں پر پہلی جیسی تحقیر اسے نہیں دکھائی دے گی۔ اسے اطمینان ہوگا۔ کوئی عورت کہے گی، 'جاؤ بلونا وصول کرو۔ میرے گھر والے نے تو کب کا لے بھی لیا۔'

'وہ کام بھی کرنے لگا؟'

'ہاں۔ دھیرے دھیرے کرنے لگے ہیں۔ روز روز بازار کے کتنے چکر لگاتے۔'

'تم بھی کام لانا شروع کردو۔ ان میں سے ایک اسے صلاح دے گی۔ 'غرض دونوں کو ہوتی ہے۔ انہیں کام کی، تمہیں پیٹ کی۔'

وہ نائنوں کی طرف ایک بار پھر غور سے دیکھے گی۔ اسے لگے گا کہ وہ یہ سب باتیں سنجیدگی سے کر رہی ہیں۔ وہ سدام کی بہو کو دیکھنے لگے گی۔ اسے اس میں حیرت انگیز تبدیلی محسوس ہوگی۔ پہلے وہ زیادہ تر کسی سے بات نہیں کرتی تھی اور بولتی بھی تو اپنے ہی بارے میں بولتی تھی۔ دھوبن کو احساس ہوگا کہ اوروں کے بارے میں اس نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا۔ اسے خیال آئے گا کہ اب اس کی چیخیں بھی سنائی نہیں دیتیں۔ اس کو پچھتاوا ہونے لگے گا کہ ان عورتوں کے ڈر سے وہ اتنے دن بیکار گھر بیٹھی رہی۔ وہ تیز تیز قدم رکھتی ہوئی مسلمانوں کے محلے کی طرف چل دے گی۔ دن بھر گھر گھر سے بلونے کے چاول جمع کرے گی۔ اتنا چاول وہ ایک پھیرے میں گھر نہیں لا پائے گی۔ اس کے لئے اسے تین چار چکر لگانے پڑیں گے۔ ساتھ میں دھلائی کے لئے کپڑوں کی گٹھریاں بھی لائے گی۔

اس رات، بہت دنوں کے بعد، وہ اپنے گھر کا سامنے والا دروازہ پورا کھول کر رکھے گی۔

سدام کی بہو ایک دن مسلمانوں کے محلے کے کنویں میں کود کر جان دے دیگی۔ وہ رات کے وقت گھر سے بھاگتی ہوئی نکلے گی اور سدام بھی اس کے پیچھے پیچھے دوڑتا ہوا آئے گا لیکن وہ اس کے ہاتھ نہیں آئے گی۔ بہت دیر تک کوئی نہیں جان پائے گا کہ یہ کیا ہورہا ہے۔ مگر جب سدام چیخ کر اس کے پیچھے بھاگنے لگے گا تو لوگوں کو معلوم ہوگا کہ اس کی بہو گھر سے بھاگ نکلی ہے۔

رات کا وقت ہوئے بھی تب زمین سے گرم بھاپ اٹھ رہی ہوگی۔ مسلمان کھانا کھا کر ہوا خوری کے لئے اپنے اپنے آنگن میں آ گئے ہوں گے۔ سدام زور زور سے چیختا ہوا مسلمانوں کے محلے میں آئے گا اور اپنی بہو کو ڈھونڈنے لگے گا لیکن اسے کسی نے نہیں دیکھا ہوگا۔ وہ پورے محلے کا چکر کاٹے گا۔ تب کوئی اسے سمجھا بجھا کر واپس بھیجے گا، 'آجائے گی، جائے گی کہاں؟' سدام گھر لوٹ کر رات بھر دروازہ کھولے بیٹھا رہے گا لیکن اس کی بہو واپس نہیں لوٹے گی۔

وہ صبح ہوتے ہی قادر خان کا لڑکا اسے بلانے آئے گا۔ وہ ڈرتا ہوا اس سے کہے گا، 'بابا تم کو بلا رہے ہیں۔' نیند سے بھاری آنکھیں کھول کر وہ بیٹھے بیٹھے پوچھے گا، 'کیوں رے بابا...'

قادر خان کے لڑکے کے لئے یہ بالکل غیر متوقع سوال ہوگا۔ وہ چڑ کر جواب دے گا، 'تمہاری کم بختی آ گئی ہے اس لئے...'

سدام اسے کوئی جواب نہیں دے گا۔ قادر خان کا لڑکا یہ سوچ کر اپنی زبان چبائے گا کہ اسے ایسی بات نہیں کہنی چاہئے تھی۔ پھر وہ دھیرے سے سدام کو سنائی دینے والی آواز میں بتائے گا، 'تمہاری بہو کنویں میں کود گئی ہے۔'

'ارے، یہ کب ہوا بابا، یہ کب ہوا؟' سدام عام سے لہجے میں کہے گا۔ اس بھیانک خبر کا اس پر کوئی

اثر نہیں ہوگا۔ اس کے چہرے پر ایسا تاثر ہوگا جیسے اسے پہلے سے معلوم تھا کہ اس کی بہو کا آخر کار یہی انجام ہونا تھا۔

قادر خان کا لڑکا کہے گا، 'مجھے نہیں پتہ، بابا نے صبح ہی لاش دیکھی۔ سب لوگ وہیں جمع ہیں۔'

سدام جیسے تیسے اٹھ کھڑا ہوگا۔ پھر وہ کسی عورت کی طرح گلا پھاڑ کر رونے لگے گا۔ نائی واڑے کے مرد اور عورتیں باہر نکل آئیں گی۔ یہ خبر پاتے ہی سب کنویں کی طرف لپکیں گے۔ ان میں سے کوئی سدام کو بھی کھینچ لے جائے گا۔ ان کے پیچھے قادر خان کا لڑکا سہما ہوا سا چل رہا ہوگا۔

کنویں پر بہت بڑا مجمع اکٹھا ہو چکا ہوگا۔ مسلمان اب تک اس کی لاش باہر نکال چکے ہوں گے۔ گرمی کی وجہ سے کنویں میں پانی کم ہوگا۔ وہ گندہ ہو جائے گا۔ اس لئے مسلمان عورتیں ہمیشہ کی طرح پانی بھرنے اس کنویں پر نہیں آئیں۔ قریب ایک فرلانگ دور دوسرے کنویں کا رخ کریں گی۔ اس کنویں پر کلواڑی پانی بھرتے ہیں۔ مسلمان عورتوں کو پانی بھرنے آتے دیکھ کر کلواڑنیں انہیں راستہ دینے کے لئے کچھ بولے بغیر ایک طرف ہو جائیں گی۔

سدام بہو کی لاش کے پاس زور زور سے دہاڑیں مار کر رونے لگے گا لیکن کسی اور کو اس کے مرنے کا کوئی خاص دکھ نہیں ہوگا۔ کوئی جا کر پولیس کو اطلاع دے گا۔ پولیس کے آنے تک لوگ سدام کا رونا دھونا خاموشی سے سنتے رہیں گے۔ پھر ایک ایک کر کے جانے لگیں گے۔ پولیس کے سامنے کوئی شخص سدام کی بہو کی چیخوں کا ذکر نہیں کرے گا اور پولیس خودکشی کو موت کی وجہ قرار دے کر معاملے پر مہر لگا دے گی۔

اس حادثے سے سدام آخر پاگل ہو جائے گا۔ وہ تمام دن اپنے برآمدے میں بیٹھا رہا کرے گا۔ رات کو دروازہ کھول کر اندر کے کمرے میں جا بیٹھا کرے گا۔ بہو کو زور زور سے پکارتا رہے گا لیکن اس کے چلانے پر کوئی اتنا دھیان نہیں دے گا جتنا اس کی بہو کی چیخوں کو دیا جاتا تھا۔

سدام کی بہو کے کود کر جان دینے کی وجہ سے مسلمان کچھ دن تک اس کنویں کا پانی استعمال نہیں کریں گے۔ پانی نہ نکالنے جانے کی وجہ سے کنویں میں پانی کی سطح اونچی ہو جائے گی۔ اس پر کائی جمنے لگے گی اور فرلانگ بھر دور جا کر پانی لانے سے ان کی عورتیں بیزار ہو جائیں گی۔ آخر برسات سر پر آ گئی ہے، مسلمان ایک رات کنویں کی پوری طرح صفائی کریں گے۔ اس کی تہہ کی گاد نکالیں گے پھر پوٹاشیم پر میگنیٹ ڈالیں گے۔ ان دن تک پانی بڑھنے دیں گے اور دوسرے دن سے اس کنویں کا پانی پھر سے استعمال کرنے لگیں گے۔

اور پھر ایک دن بارش ہوگی۔ واششٹھی ندی کے پاٹ کو دھنک جیسا خم دار بنانے والی پہاڑی بارش کی سفید چادر سے ڈھک جائے گی۔ جوار پر آئی ہوئی ندی پر بارش کی بوچھار پڑنے سے پانی میں لہریں اٹھنے لگیں گی۔ آسمان میں تیرتی دھول بارش کے ساتھ نیچے اتر کر پانی میں گھل جائے گی۔ پیڑ اور جھاڑیاں جیسے کینچلی بدل کر پھر سے نئی اور ہری بھری دکھائی دینے لگیں گی۔ گیلی زمین سے کچھ دیر تک پانی کی بھاپ نکلتی رہی گی۔ پھر زمین ٹھنڈی ہو جائے گی۔

دھیرے دھیرے ہوا میں بھی ٹھنڈک آئے گی۔ ایسی بارش روز ہونے لگے گی۔ پوری وادی ہری بھری دکھنے لگے گی۔ اور اچانک ایک دن لکشمی بھی کہیں سے آ کر ان میں شامل ہو جائے گی۔ صرف سمتی اور جنار دھن کہیں نہیں ہوں گے۔

لیکن سمتی پانچ چھ مہینے بعد ممبئی میں ملے گی۔ وہ میرا پتہ ڈھونڈتی ہوئی میرے گھر آئے گی۔ اب تک اس کی شادی ہو چکی ہوگی۔ اس کا شوہر بھی اس کے ساتھ ہوگا۔ وہ غالباً کہیں کلرکی کرتا ہوگا۔ وہ مجھ سے اس کا رسمی تعارف کرائے گی اور پھر بیٹھ کر مجھ سے باتیں کرنے لگے گی۔ وہ ہماری باتوں میں شریک نہیں ہوگا، خاموشی سے سنتا رہے گا۔ وہ مجھ سے ہمارے گھر کا حال چال دریافت کرے گی۔ قصبے کی خبریں معلوم کرے گی۔ وہ پہلے کے سے کھلے پن سے بولتی رہے گی۔ اس کا شوہر اسے بیچ میں روک کر چلنے کو کہے گا لیکن وہ اس پر دھیان نہیں دے گی۔ جب وہ بار بار اس سے اٹھنے کا تقاضا کرے گا تو وہ ناچار جانے کے لئے اٹھ کھڑی ہوگی۔ وہ مڑ کر چلنے لگے گی لیکن اس کے قدم سست پڑ جائیں گے۔ مجھے محسوس ہوگا کہ وہ مجھ سے اور باتیں کرنا چاہتی ہے لیکن وہ ایک بار پیچھے مڑ کر دیکھنے کے بعد تیز تیز قدم اٹھاتی ہوئی وہاں سے چلی جائے گی۔

اور میں سوچنے لگوں گا کہ وہ دروازے تک پہنچ کر کیوں رک گئی تھی۔ وہ مجھے کیا بتانا چاہتی ہے؟ کیا شوہر کے ساتھ ہونے کی وجہ سے وہ کچھ نہ کہہ پائی۔ کہیں وہ بعد میں اکیلی یہاں آنے کا ارادہ تو نہیں کر رہی؟ اس کے اور میرے سمبندھ کی پار نہ ہو سکنے والی لکشمی ریکھا سے اس کے دل میں جو آگ اب بھی خاموشی سے سلگ رہی ہے کیا وہ مجھے اس کا احساس دلانے کے لئے مجھ سے دوبارہ ملنا چاہتی ہے؟

ایک بار جب میں قصبے کے پل پر بیٹھا تھا تب وہ مجھے غیر معمولی طور پر حسین معلوم ہوئی تھی۔ ہمارے بیچ کی لکشمن ریکھا پار کرنے کا وہی ایک لمحہ تھا۔ وہ پل یونہی گزر گیا، اس کا مجھے احساس ہوا تھا۔ لیکن اب میں اس لمحے کے احساس سے دور رہنے کا خواہش مند ہوں اور میری حد تک یہ کہانی وہیں ختم ہو جائے گی۔

❑❑❑

اک تیر میرے سینے میں مارا کہ ہائے ہائے

محبوب حسن

طنز و مزاح نگار

چار کتابوں کے مصنف

اتر پردیش اردو اکادمی سے انعام یافتہ

اردو اور انگریزی فکشن پر

جے این یو سے ڈاکٹریٹ

وطن وارانسی

راج کامپلیکس، چھیتو پور

بی ایچ یو، وارانسی

رابطہ: 8381856066

دنیا میں شاید ہی کوئی سینہ/ دل ایسا ہو، جس میں عشق و محبت کی کونپلیں نہ پھوٹی ہوں۔ بلا شبہ پوری کائنات محبت کی بنیاد پر کھڑی ہے۔ عشق کے مختلف رنگ و روپ ہوتے ہیں۔ انسان تو انسان چرند پرند بھی محبت میں تصورِ جاناں کیے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اپنے بچھڑے کو چاٹ چاٹ کر اپنی محبت کا اظہار کرنے والی گائے کبھی کبھار بیل کی یاد میں تڑپ اٹھتی ہے۔ عشق میں گرفتار دریا کی مچھلیاں بھی سطح آب پر اٹھکھیلیاں کرتی ہیں۔ شب ہجراں میں سمندر کی موجیں عالم دیوانگی میں چاند کے لیے بے تاب نظر آتی ہیں۔ طوطا مینا کی کہانی بھی دعوت عشق کے لیے مشہور ہے۔ چلچلاتی گرمی میں تپتی ہوئی بنجر زمین بارش کے قطروں سے ہم کنار ہوتے ہی چہک اٹھتی ہے۔ یہاں تک کہ نازک کرمک بھی جام شہادت نوش فرمانے کی غرض سے آتشِ عشق میں بے خطر کود پڑتے ہیں۔ مرغے و مرغیوں اور بکرے و بکریوں کو بھی جامِ عشق سے پرہیز نہیں۔ یہ تمام تر قدرتی مظاہر مذہبِ عشق کے منکر کے لیے باعث عبرت ہیں۔

آگ کے دریا کو ڈوب کر پار کرنے والا عاشقوں کا کنبہ ابتدائے آفرینش سے ہی عدل و انصاف کے لیے گڑگڑا رہا ہے۔ عشق و جنون کے شعلوں میں نہانے اور صبر و قناعت کا کاڑھا پینے والے بے لوث عاشقوں کے لیے زمین تنگ ہو چکی ہے۔ لیلا مجنوں، ہیر رانجھا، شیریں فرہاد، رومیو جولیٹ کی مقدس روایات کو اپنے دوش ناتواں پر اٹھانے والے اس قبیلے کے لیے انصاف کے روشن دان بھی نہ کھل سکے۔ ایسے مایوس کن حالات میں بے چارے عاشق حضرات محرومی کے سمندر میں ہچکولے کھانے پر مجبور ہیں۔ گیلی لکڑی کی مانند سلگنا اہل غم کے لیے زندگی کی معراج ہے۔ دل میں صبر ایوبی سمیٹے اور آدابِ محبت کی لکیروں کا فقیر عاشق گونگے کی زندگی بسر کرتا ہے۔ بقول میرؔ: پاس ناموس عشق تھا ورنہ/ کتنے آنسو پلک تک آئے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ صبر آزما صورت میں بھی عاشق روتا گھبراتا نہیں بلکہ دونوں جہاں ہار کر بھی بہ خوشی شبِ غم گزارتا ہے۔ اپنے ارمانوں پر جھاڑو پھر جانے اور ہجر و فراق کے جاں سوز لمحات میں بھی چراغاں کرتا ہے۔ لیکن افسوس کہ عشق کا سفر اکثر شہد کی میٹھاس سے شروع ہو کر نیم کی کڑواہٹ کے ساتھ ہی ختم ہوتا ہے۔

میرؔ نے دل کے کھو جانے کو بجا طور پر سانحہ قرار دیا ہے۔ درحقیقت عشق سراپا داخلی کیفیت کا نام ہے۔ اس کا سفر زخم سے ناسور تک کا ایک ایسا لامتناہی سلسلہ ہے، جس کا مرہم تلاش کرنا دیوانے کے خواب کا سا ہے۔

عاشق کی محبت آمیز غلامانہ زندگی میں بھی خوشیوں کے ہزار ہا چراغ روشن رہتے ہیں۔سر پر صبر و قناعت کا تاج پہنے عاشق کی زندگی کا ہر لمحہ صدیوں کو محیط ہوتا ہے۔اگر کسی میں صبر و قناعت کا جذبہ اور قوت تحمل کا فقدان ہو تو اس کے لیے کوچۂ یار سے رسم و راہ فضول ہے۔اقبالؔ کے نزدیک عشق اندیشۂ سود و زیاں سے برتر ہوتا ہے۔ولیؔ کے نزدیک اپنے اشکِ خوں سے وضو کرنے والا ہی مذہبِ عشق کا سچا نمازی ہو سکتا ہے۔ چچا غالبؔ تو آنکھوں سے اشک کی بجائے لہو ٹپکانے کی بات کرتے ہیں۔فیضؔ نے عاشقوں کے آہنی جذبے اور اس کے تحمل کا نقشہ کچھ اس انداز میں کھینچا ہے کہ:تم آئے ہو نہ شب انتظار گزری ہے/تلاش میں سحر بار بار گزری ہے۔ ظاہر ہے کہ شب ہجراں کے ڈنک کو برداشت کرنا بازیچہ اطفال نہیں ہے کیوں کہ

'آہ کو چاہیے اک عمر اثر ہونے تک'

دور اندیش شاعر مرزا غالبؔ کو عاشق/معشوق کے ظلم و ستم کا شدید احساس تھا۔اسی لیے تو انہوں نے معشوق پر فریب قتل و غارت گری کا برملا الزام لگایا تھا۔ظاہر ہے کہ محبوب نہایت چالاکی اور ہشیاری سے بغیر کسی توپ و تفنگ کے ہی عاشق کو فنا کرنے کا ہنر جانتا ہے۔بقول غالبؔ:

اس سادگی پہ کون نہ مر جائے اے خدا
قتل ہیں کرتے اور ہاتھ میں تلوار بھی نہیں

لیکن افسوس کہ ایسی پراسرار حالت میں ہونے والی عاشق کی موت تعزیرات ہند کے کسی دفعہ میں نہیں آتی۔بے چاری عدالتیں تو سر سے پاؤں تک بے بسی کی زنجیروں جکڑی ہوتی ہیں۔ٹھوس ثبوت کے تیل سے ہی ان کی آنکھوں کی بینائی آتی ہے۔بے کسی و بے بسی کا مارا ہوا عاشق ستر ستر کوئیں جھانکنے کے باوجود ثبوت اکٹھا کرنے سے قاصر رہتا ہے۔کیوں کہ دل کے نہاں خانوں میں پرورش پانے والے زخم اور ناسور کو لباس مجاز میں ظاہر کر پانا ناممکن ہے۔اس ترقی یافتہ دور میں ہر طرح کے انسانی حقوق کی حفاظت کی جا رہی ہے لیکن بے بس عاشقوں کے پاک و مقدس جذبات و احساسات کی پامالی عام ہے۔مجنوں صفت انسان کی جھلستی ہوئی خواہشات اور سلگتے ہوئے ارمان کا سراغ لگا پانا میڈیکل سائنس کے بس کی بات نہیں۔ایکسرے ،الٹرا ساؤنڈ ،سی ٹی اسکین اور ایم آر آئی جیسی طبی حکمت عملی عشق و جنون کی کیفیت پر قابو پانے سے قاصر ہے۔کیوں کہ عاشق کی داخلی کیفیات ہمالیہ سے بلند تر اور سمندر سے بھی زیادہ گہری ہوتی ہیں۔

حیرت کا مقام ہے کہ میڈیکل سائنس نے ابھی تک ایسا کوئی آلہ ایجاد نہیں کیا ،جس کے توسط سے کسی عاشقِ زار کی ازلی خستہ حالی کا اندازہ لگایا جا سکے۔ سائنس دانوں پر عاشقوں کی اجتماعی لعنت!! آج ڈاکٹروں کی ٹیم بڑے بڑے دعوے کرتے ہوئے نظر آتی ہے۔لیکن ان میں عاشقوں کے سامنے لب کشائی کرنے کی ذرا بھی ہمت نہیں۔قابل غور ہے کہ خون کے ٹیسٹ سے مختلف طرح کی مہلک بیماریوں کی جانچ ممکن ہے لیکن عاشق کی رگوں میں گردش کرنے والے لہو کی شدت کا اندازہ کیوں کر ممکن نہ ہو سکا؟اے کاش کوئی ایسا کارگر طبی آلہ ایجاد ہو جاتا،جس کی مدد سے عاشق کے سینے میں دہکنے والی عشق کی آگ اور دل میں اٹھنے والے شراروں کی تشخیص ہو پاتی!! کاش کوئی ایسی مشین وجود میں آجاتی ،جو اس لاغر مخلوق پر ڈھائے گئے ظلم و ستم کی ہر کہانی بیان کر دیتی!!اگر عاشقوں کے زخموں کا شمار کر پانا ممکن ہوتا تو حکومت مجاہدِ آزادی کی طرز پر اہل درد کو بھی کسی نہ کسی وظیفے سے ضرور نوازتی!

تاریخ شاہد ہے کہ عاشقوں پر ظلم و ستم کا یہ کھیل ازل سے ہی جاری ہے۔آج بھی محبت کا شیش محل پتھروں کے خوف سے لرزاں ہے۔کبھی رسوائی کا خوف تو کبھی معشوق کی بے وفائی کا صدمہ!!جو یائے جنوں اپنے جسم و جاں کی پرواہ کیے بغیر تازہ ویرانے کی تلاش میں دریائے عشق اور پرخار وادیوں کی صحرانوردی کرتا ہے۔شکر کہ بارات عشق آج بھی سج دھج کر نکل رہی ہے۔قابل رحم عاشق موسم بہار میں چہچہانے کی بجائے اپنے زخموں کو چھپانے کے لیے جھاڑیوں میں پناہ لیتا ہے۔محبت کا دیوتا کبھی دیوار میں زندہ چنوا دیا گیا تو کبھی کسی نے صحرا میں تڑپ تڑپ کر اپنی جان دے دی۔کسی کو زہر کا پیالہ پینے پر مجبور کیا گیا تو کسی نے تیشے سے خود کو ہلاک کر لیا۔آنکھوں سے لہو ٹپکانے والے میاں غالبؔ نے فرہاد جیسے بلند مرتبہ عاشق کا مذاق اڑا کر اپنی عاقبت خراب کر لی۔خود سر شاعر نے ''تیشے بغیر مر نہ سکا کوہکن اسد'' کے پس پردہ اس کی شہادت پر انگلی اٹھائی ہے۔اپنے ریشمی زخموں پر نازاں محبت کے فرشتے آج بھی بانسری سے سازِ عشق چھیڑنا اپنا مقصد حیات تصور کرتے ہیں۔ بقول جاں نثار اخترؔ:

جھیلی ہے سزا خوداری کی، پر ہاتھ نہیں پھیلائے ہیں
اوروں کیلئے ہر درد سہا، اس پر بھی برے کہلائے ہیں
تیروں کا جنھیں فن سکھلایا، خود تیر انھیں سے کھائے ہیں
جو زخم ملے ہیں اپنوں سے، ان زخموں کو گنوائیں کیا
یہ زخم ہی اپنا حصہ ہیں، اِن زخموں پر شرمائیں کیا

شاعری اور عشق کے درمیان کُرتے اور پائجامہ کا رشتہ ہوتا ہے۔یعنی کُرتے کے بغیر پائجامہ تنہا کسی کھونٹی کی نذر رہتا ہے۔ شاعروں کا دل کسی شاخ گل کی مانند ہوائے عشق کا ہلکا سا لمس ملتے ہی کانپ اٹھتا ہے۔طبیعت میں نازکی ایسی کہ موم کی طرح ہلکی سی تپش سے ہی پگھل جائے۔علامہ اقبالؔ کا فلسفۂ خودی عشق کا محتاج نظر آتا ہے۔ان کے فلسفے کی رو سے عاشقوں پر موت حرام ہے۔اقبالؔ نے عشق کے مضراب کو تارِ حیات کا نغمہ قرار دیا ہے۔اردو کے بیشتر شعرا کا شاعرانہ محل عشق و محبت اور درد و غم کے

اینٹ گارے سے ہی تیار ہوا ہے۔اضطرابی کیفیت سے آشنا مجازؔ شہر کی تنہا رات میں ناشاد و ناکارہ بھٹکتے رہے۔ان کی لازوال نظم ''آوارہ'' نو واردان عشق کے لیے سراپا نصیحت ہے۔وہ بار بار اپنے غمِ دل اور وحشت دل سے سوال کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔یہ عشق ہی تھا،جس نے انھیں درد وغم کی وحشت ناک تاریکی میں دھکیل دیا۔افسوس کہ مجازؔ دل کے نہاں خانوں میں راز ہائے غم لیے دنیا سے رخصت ہوئے۔ ایسے عشق پسند شاعروں کی فہرست کافی طویل ہے،جو معشوق کے تیر نیم کش کی خلش سے نڈھال رہے۔کالی داس اور تلسی داس کی زندگی کی کہانی بھی نامراد عشق کے ساتھ ختم ہوئی۔ یہ ناکامی عشق کا ہی کمال تھا جس نے انھیں شاعری کے اوج ثریا پر پہنچا دیا۔بے وفائی کے نشتر سے نڈھال انگریزی کے معروف شاعر John Donne نے "Go and Catch a Falling Star" جیسی زہر میں بجھی ہوئی نظم تخلیق کر دی۔یہ لازوال نظم ہی ان کے زخموں کے لیے تریاق بن گئی۔اس میں شاعر نے ظالم معشوق کو کوسنے کے لیے سو سو جتن کیے ہیں۔موصوف کے مطابق آسمان سے گرتے ہوئے ستارے کو پکڑنا عین ممکن لیکن اس دنیا میں رنگین فتنے سے وفا کی امید فضول ہے۔شکستہ دل شاعر نے معشوق کو بے وفائی کی دکان ثابت کر دیا ہے۔

راقم الحروف کم عمری میں ہی تاج محل کی عظمت سے متعارف ہو گیا تھا۔چاروں سمتوں سے عاشقوں کی فوج جوق در جوق یہاں کھینچے چلی آتی ہے۔ میں نے قصداً/عقیدتاً مئی کی شدید گرمی میں وہاں حاضری لگائی تھی۔بقول میر انیسؔ ''بھن جاتا تھا جو گرتا تھا دانہ زمین پر'' اس نقش کو رنگِ ثباتِ دوام حاصل ہے، کیوں کہ اس کی بنیاد سنگ عشق پر ٹکی ہوئی ہے۔کیوں نہ لگے ہاتھ اپنے مخطوطاتِ محبت کے چند اوراق پلٹے دیے جائیں؟ برسوں قبل خاکسار کے دل میں بھی ایک تاج محل تعمیر کرنے کا معصومانہ خواب پیدا ہوا تھا۔شکر خداوندی کہ بروقت ممتاز کا ساتھ بھی نصیب ہوا۔ابتدائے عشق سے ہی تاج محل کا خیالی نقشہ میرے خوابوں میں پرورش پاتا رہا۔گنگا ندی کا کنارہ اپنی باہیں پھیلائے منتظر تھا۔اس خواب کو حقیقت کی سرزمین پر اتارنے کا آخری مرحلہ ہی باقی رہ گیا تھا کہ حالات یکا یک بے وفا نکلے۔ستم ظریفی ایسی کہ گریہ بار آنکھیں نیند کو ترستی تھیں اور حلق سوکھ کر کانٹا ہوا جاتا تھا۔سر پر آسمان نہ پاؤں تلے زمین۔رسمِ فاتحہ خوانی کے بعد فاقہ کشی کی مجلس شروع ہوئی۔اپنے محبوب کی باہوں میں ہی دم توڑنے کے خواب خرگوش کا اظہار کرنے والا عشوہ ساز نے خاکسار کو دم بخود ضرور کر دیا ہے۔خدا معاف کرے!!اس پری وش کا اسیر زلف ہو کر ناچیز کئی بار جمعہ کی نمازوں سے بھی محروم رہا۔جیسے خدا اور وصال صنم کے درمیان معلق رہنا ہی اپنے کرم جلے مقدر میں لکھا ہو!! روزِ محشر میں اپنی نیکیاں دینے اور سفر آخرت تک رسم وراہ نبھانے کی قسم کھانے والی اس طلسمی مہ جبیں نے دارفانی میں ہی لکیریں اس ادا سے کھینچی کہ ایک تیر میرے سینے میں مارا کہ ہائے ہائے!!

میری والدہ سے بھی زیادہ محبت کا دم بھرنے والی اس گل پیکر کے پاؤں میں جانے کون سی آہنی بیڑیاں آپڑیں تھیں؟ کون سمجھائے کہ رقص کرنا ہو تو پاؤں کی زنجیر نہ دیکھ۔ایک دہائی کے دیرینہ مراسم کی سانسیں ہچکیوں کے ساتھ اکھڑ گئیں۔میری محبت کے چمن زار پر خزاں نے اپنے منحوس ڈیرے ڈال دیے ہیں۔

سچ کہیے تو بے وفائی نے میرے خواب کی سو منزلہ عمارت ڈھا دی ہے۔میں نے کبھی بھی اپنے آئینۂ دل کی پرواہ نہ کی کیوں کہ شکستہ ہو تو عزیز تر ہے نگاہ آئینہ ساز میں۔اے کاش کہیں ایسا ہوتا کہ چکنا چور ہونے کے بعد زمانے کو آواز سنائی پڑتی!! اس سانحہ کے بعد مجھے ایسا محسوس ہوا کہ تمناؤں میں الجھایا گیا تھا اور کھلونہ دے کے بہلایا گیا تھا۔دعا ہے کہ محبت میں دونوں جہاں ہارے ہوئے عاشق کی شب غم کی مسافت زیادہ طویل نہ ہو۔کیوں عشق کا کاٹا ہوا انسان زندگی کرنے کا حوصلہ نہیں رکھتا۔رہِ عشق کے مظلوموں کا تجربہ تو یہی کہتا ہے کہ عشق پر کسی کا زور نہیں چلتا کیوں کہ یہ وہ آتش ہے، جو لگائے نہ لگے اور بجھائے نہ بجھے!!لیکن اس آتش میں جھلسنے کا اپنا مزہ ہے۔

خدا جھوٹ نہ کہلوائے !!اپنی ناآسودہ حسرتوں کے ساتھ سانسیں لینا اپنا مقدر بن گیا ہے۔سخت جان تنہائی کا یہ عالم ہے کہ صبح کرنا شام کا لانا ہے جوئے شیر کا۔شکستگیِ دل کی اس منزل پر اپنی جیب کو حاجت رفو بھی نہیں رہی۔زخموں سے سارا وجود اس قدر تار تار ہے کہ پیراہن اب بدن سے چپکنے لگا ہے۔پاؤں کے آبلوں سے طبیعت گھبرا گئی ہے لہٰذا اب مجھے کسی پرخار راہ کی تلاش ہے۔میڈیکل سائنس کے تمام آلات زخموں کی سراغ رسانی میں ناکام ثابت ہو گئے ہیں۔

کبھی کبھی یہ گمان بھی گزرتا ہے کہ اپنے زخموں کو رفتہ رفتہ عرفان حاصل ہو رہا ہے۔سنا ہے کہ حد سے بڑھا ہوا درد دوا بن جاتا ہے یا یہ کہ رنج کا خوگر ہوا انساں تو مٹ جاتا ہے رنج لیکن خدا جانے وہ پرسکون منزل کب آئے گی؟ یہ ضرور ہے کہ بے وفائی کا عطا کردہ غموں کی سلطنت کا تنہا وارث بنا بیٹھا ہوں۔راہِ عشق میں فنا ہو جانا بھی مقدر کی بات ہے۔حضرتِ فانیؔ کے اس دعوے کو جھٹلانا کم حوصلگی کی روشن دلیل ہوگی!!

وہ جی گیا جو عشق میں جی سے گزر گیا
عیسیٰ کو ہو نوید کہ بیمار مر گیا

❑❑❑

ایک سال نئی مثال

ہمہ جہت ترقی کے نئے دور کا آغاز

نجیب انصاری

ادیب اور صحافی

مختلف اردو اخبارات میں

خدمات کے بعد محکمۂ اطلاعات

ورابطۂ عامہ سے سبکدوش

'نیا دور' کے سابق مدیر

وطن کانپور

ایس ایس سی-57، سیکٹر-سی

کرسی روڈ، لکھنؤ

رابطہ: 9450604369

اتر پردیش میں موجودہ حکومت نے تبدیلی، ترقی اور غریبوں کو بااختیار بنانے کے عزم کے ساتھ ۱۹/مارچ ۲۰۱۷ء کو حلف لیا تھا۔اس طرح آج ریاستی حکومت اپنے دور اقتدار کا ایک سال مکمل کر رہی ہے۔کسی بھی ریاست میں تبدیلی، ترقی اور پیشرفت کے لئے محض ایک سال کی مدت ایک چھوٹا وقفہ ہے۔ محدود وسائل کے ساتھ اتر پردیش جیسی بڑی ریاست کے لئے یہ ایک چیلنج بھی ہے۔

حکومت اتر پردیش کی جانب سے لوک بھون میں ریاستی حکومت کا ایک سال مکمل ہونے پر 'ایک سال نئی مثال' پروگرام کا انعقاد کیا گیا۔جس میں اتر پردیش کے گورنر جناب رام نائک نے پروگرام کو خطاب کرتے ہوئے کہا کہ ریاستی حکومت نے ترقیات کے لئے گزشتہ ایک سال کے دوران مثبت فیصلہ کرتے ہوئے کام کیا۔حکومت نے اتر پردیش کی ترقی کو ایک نئی سمت اور جہت عطا کی ہے۔انہوں نے کہا کہ اتر پردیش بڑی آبادی والی ریاست ہے ایسے میں اس کی ترقی پر خصوصی توجہ دینی ہوگی۔ریاستی حکومت نے اپنی ذمہ داریوں کی ادائیگی بحسن وخوبی انجام دی ہے۔یوگی جی نے ان کے مشورے پر اتر پردیش کا یوم تاسیس منعقد کرنے پر رضامندی ظاہر کی جس سے اب یہ تقریب ہر سال ہوگی۔ریاستی حکومت نے سال فروری ماہ کے دوران اتر پردیش انوسٹرس سمٹ-۲۰۱۸ء کا انعقاد کر یہ پیغام دیا کہ ریاست اب صنعتی سرمایہ کاری کے لئے پوری طرح تیار ہے۔انہوں نے کہا کہ جلد ہی اتر پردیش ملک کا اُتم پردیش بن جائے گا۔

پروگرام میں اتر پردیش کے وزیر اعلی یوگی آدتیہ ناتھ نے کہا کہ ریاست میں نوجوان بے روزگاروں کے لئے روزگار کا بڑا موقع فراہم کراتے ہوئے ۶۴ محکموں میں چار لاکھ سرکاری عہدوں پر انتخاب کی کارروائی ریاستی حکومت کرنے والی ہے۔انہوں نے کہا کہ ریاستی حکومت تعلیم اور امتحان کے نظام کو آسان بنانے کی سمت کارگر کارروائی کر رہی ہے۔

شہروں میں بہتر ٹریفک نظام مہیا کرانے کی کوششوں کا ذکر کرتے ہوئے انہوں نے کہا کہ ۳۳ ہزار کروڑ روپیہ کی لاگت سے کانپور، آگرہ اور میرٹھ میں میٹرو ریل کی اسکیم لائی جا رہی ہے۔اس کے علاوہ نوئیڈا اور گریٹر نوئیڈا کے میٹرو ریل پروجیکٹ بھی ستمبر ماہ تک فعال ہو جائیں گے۔

خواتین کی سہولت کے لئے ۵۰ پنک بسوں کی سروس شروع کی جارہی ہے۔ان میں سے ۱۰ ربسوں میں ڈرائیوراور کنڈکٹربھی خواتین ہوں گی۔انہوں نے کہا کہ مغربی اترپردیش کے آلو پیدا کرنے والے کسانوں کے لئے آلوتر قیاتی بورڈ بھی قائم کیا جائے گا۔

عام مٹی کے استعمال میں عوام کو پیش آرہی دقتوں کے پیش نظر ریاستی حکومت نے معمولی عام مٹی پر رائلٹی ختم کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔اگر پولیس محکمہ کے افراد نے مٹی لے جانے والے کسانون کو پریشان کیا توان کے خلاف سخت کارروائی کی جائے گی۔اینٹ بھٹہ مالکان اگر اینٹ کے دام کم کریں گے تو بھٹوں کو بھی مٹی کی رائلٹی معاف کر دی جائے گی۔

حکومت نے ہائی اسکول اورانٹر کے امتحانات میں پہلی بارامتحان مراکز پرسی سی ٹی وی کیمرے اور دیگر بندوبست کراکے نقل سے پاک امتحان منعقدکرائے ہیں۔

موجودہ حکومت کا ایک سال مکمل ہونے پرلوک بھون میں منعقد پروگرام کا افتتاح کرتے ہوئے وزیراعلیٰ اترپردیش جناب یوگی آدتیہ ناتھ جی،ساتھ میں ہیں گورنراترپردیش جناب رام نائک،نائب وزیراعلیٰ جناب کیشو پرسادموریہ اورڈاکٹر دنیش شرما

پروگرام کے دوران مختلف اسکیموں کے مستفیدین پر مبنی فلموں کی نمائش کی گئی۔اس موقع پر یوپی پولیس پرمرکوز ایک فلم کی نمائش بھی کی گئی،'ایک سال نئی مثال' فلم بھی اس موقع پر دکھائی گئی۔پروگرام کے دوران محکمۂ اطلاعات کی جانب سے شائع کتابچہ'ایک سال نئی مثال' کا اجراء بھی عمل میں آیا۔اس دوران اینٹی کرپشن پورٹل بھی لانچ کیا گیا اورتقریب میں ثقافتی پروگرام بھی منعقد کئے گئے۔اس ایک سال میں ریاستی حکومت کا سب سے اہم کارنامہ یہ رہا کہ اس نے ریاست سے خوف کا ماحول ختم یا۔نظم ونسق کی مشینری کو فعال کیا اور ہمہ جہت ترقی کے متعدد کام شروع کرائے۔ریاست کے وزیراعلیٰ یوگی آدتیہ ناتھ جی کی فعال قیادت میں گزشتہ ایک سال میں اترپردیش کی شبیہ میں مثبت تبدیلی آئی ہے۔جرائم اور بدعنوانی کے تئیں وزیراعلیٰ کے سخت رویئے کے سبب نظم ونسق میں بڑے پیمانے پر بہتری آئی ہے۔ریاست میں سرمایہ کاری کے لئے صنعت کاروں کا رجحان بڑھا ہے۔یہ بات گزشتہ دنوں لکھنؤ میں منعقد ہونے والی انوسٹرس سمٹ میں واضح طور پرنظر آئی۔سمٹ میں ریاستی حکومت کو بڑی تعداد میں سرمایہ کاری کی تجاویز موصول ہوئیں۔ان تجاویز کے سلسلہ میں پچیس ہزار کروڑ روپئے کی سرمایہ کاری کے ایک پروجیکٹ کا جلد ہی سنگ بنیاد رکھا جائے گا۔

وزیراعلیٰ بخوبی سمجھتے ہیں کہ صنعتی ترقی کے لئے بہترین انفرااسٹرکچر،بجلی کی فراہمی اورامن و امان کا پرسکون ماحول نہایت ضروری ہے۔یہی وجہ ہے کہ اقتدا سنبھالتے ہی وزیراعلیٰ نے ان تینوں چیزوں پر خصوصی توجہ دی۔جہاں تک بجلی کا تعلق ہے تو سال ۲۰۱۶-۱۷ء میں ریاست کی زیادہ سے زیادہ مانگ ۱۵۵۰۱ میگاواٹ کے مقابلے میں سال ۲۰۱۷-۱۸ء میں یہ ۱۸۰۶۱ میگاواٹ بجلی دستیاب کرائی گئی۔ریاست میں رائج بجلی کی فراہمی میں تفریق کوختم کرتے ہوئے ریاست کے سبھی مقامات کے لئے ایک جیسا شیڈول نافذ کیا گیا۔ریاستی حکومت کے اس فیصلے کی بڑے پیمانے پر ستائش کی گئی۔بجلی کی فراہمی میں ریاستی حکومت نے دیہی علاقوں کا بھی خیال رکھا اور وہاں رات میں بلا رکاوٹ بجلی سپلائی کی گئی۔ضلع ہیڈکوارٹر میں ۲۴ رگھنٹے،تحصیل ہیڈکوارٹر کو ۲۰ رگھنٹے اور مواضعات کو ۱۸ رگھنٹے بجلی سپلائی کی جارہی ہے۔سال ۲۰۱۶-۱۷ء میں ۲۳۵۴۱ مزرعوں کی بجلی کاری کے مقابلے میں سال ۲۰۱۷-۱۸ء میں ماہ فروری تک ۵۵۶۵۴ مزرعوں کی بجلی کاری کی گئی۔مذکورہ مدت میں جاری ۸۴۴۷۴۱ کنکشنوں کے برعکس ۳۱۶۳۸۹ کنکشن جاری کئے گئے۔اسی طرح سال ۲۰۱۶-۱۷ء میں اوسط بجلی سپلائی ۲۸۷ ملین یونٹ یومیہ تھی جو ۲۰۱۷-۱۸ء میں ترسیلی نیٹ ورک کی درآمدنی صلاحیت (ٹی ٹی سی) ۶۶۰۰ میگاواٹ تھی جو فروری ۲۰۱۸ء میں ۹۲۰۰ میگاواٹ ہو چکی ہے۔

ریاست میں صارفین کے لئے بلا رکاوٹ بجلی سپلائی یقینی بنانے کے لئے اب تک ۱۱۱ نئے ۱۱/۳۳ کے وی بجلی سب اسٹیشن چالو کئے گئے اور ۳۸۴ سب اسٹیشنوں کی صلاحیت میں اضافہ کیا گیا جس سے ۲۰۳۱ ایم وی اے صلاحیت کی پیداوار ہوئی۔اس کے علاوہ ریاست میں ۱۱۳۴۴ نئے ٹرانسفارمر لگائے گئے اور ۱۰۶۳۱ اورلوڈیڈ ٹرانسفارمروں کی صلاحیتوں میں اضافہ کیا گیا۔پردھان منتری سہج بجلی ہرگھر یوجنا (سوبھاگیہ) کے تحت دیہی علاقوں کی طرح شہری علاقوں میں رہنے والے غریب کنبوں کو بھی مفت بجلی

کنکشن کی سہولت دی جارہی ہے۔اس اسکیم میں ۱ء۱۷ کروڑ گھروں کو کنکشن دینے کا ہدف مقرر کیا گیا ہے۔ ہر گھر کو کنکشن دینے کے لئے ماہ فروری ۲۰۱۸ء تک کل ۱۵۷۸۱ خصوصی کیمپ پوری ریاست میں لگائے جا چکے ہیں۔ مجموعی طور پر ۲ء۸۵ لاکھ غریب کنبوں کے گھروں کو اور ۴ء۱۶ لاکھ عام کنبوں کے گھروں کو بجلی کنکشن جاری کئے گئے۔ اس کے علاوہ دیہی علاقوں میں خراب ٹرانسفارمروں کو ۴۸ گھنٹے میں اور شہری علاقوں میں ۲۴ گھنٹے میں بدلنے کے کام کو یقینی بنایا گیا۔سال ۲۰۱۶-۱۷ء میں جنوری ۲۰۱۷ء تک جہاں ۱۸۷۹۳ خراب ٹرانسفارمروں کو تبدیل کیا گیا وہیں سال ۲۰۱۷-۱۸ء میں جنوری ۲۰۱۸ء تک ۲۹۸ ۲۲۷ ٹرانفارمروں کو تبدیل کیا گیا۔ اس کے علاوہ بجلی صارفین کو ایک اور سہولت دیتے ہوئے سوبھاگیہ یوجنا کے تحت نئے کنکشن موقع پر ہی دینے کے لئے ای کنکشن موبائل ایپ سسٹم نافذ کیا گیا۔ اب صارفین کو کسی بھی دفتر کے چکر لگانے کی ضرورت نہیں ہے۔ پانچ کلوواٹ تک بجلی کنکشن کے لئے اسٹیمیٹ کے نظام کو ختم کرکے آسان قسطوں میں بجلی کنکشن دینے کے لئے 'سوگم سنیوجن یوجنا' نافذ کی گئی۔تین نئے کنکشن کی مانگ ہونے پر ایک بجلی پول لگا کر سرکاری کرچ پر بجلی لائن کی توسیع کی جائے گی۔

ریاست میں پہلی بار صارفین کو گھر بیٹھے خود بجلی بل تیار کرنے اور رقم کی ادائیگی انٹرنیٹ سے کرنے کی سہولت دی گئی۔ اسی سلسلہ میں ٹرسٹ بلنگ (صارفین کے ذریعہ خود ریڈنگ دے کر بل حاصل کرنا) اسکیم نافذ کی گئی جس سے ۳۳۰۰۰۰ صارفین اب تک مستفید ہو چکے ہیں۔صارفین کو ایک اور سہولت دیتے ہوئے موبائل ایپ ای نوارن کے ذریعہ بجلی بل اور سپلائی سے متعلق شکایتیں درج کرنے کا انتظام کیا گیا۔ ریاستی حکومت کی جانب سے بجلی صارفین کو بقایاجات کی ادائیگی میں صد فیصد سرچارج معافی کے لئے اسکیم نافذ کی گئی اور غیر قانونی بجلی کنکشن کو قانونی طریقے سے شامل کرنے کے لئے 'سرودا یوجنا' چلائی گئی۔ ان اسکیموں سے ریاست میں تقریباً ۲۰ لاکھ صارفین مستفید ہوئے۔

ریاست کی ترقی کے لئے بہترین انفراسٹرکچر بھی ضروری ہے۔ وزیر اعلیٰ یوگی آدتیہ ناتھ جی اس بات کو بخوبی سمجھتے ہیں۔ اسی لئے انہوں نے عنان حکومت سنبھالتے ہی ریاست کی سڑکوں کو گڑھوں سے پاک کرنے کا حکم دیا۔ان کے حکم کی تعمیل میں دسمبر ۲۰۱۷ء تک ۱۰۷۰۰۰ کلومیٹر سڑکوں میں سے تقریباً ۱۰۱۰۰۰ کلومیٹر سڑکوں کو گڑھوں سے پاک کیا گیا۔ یہ مہم مسلسل چلتی رہے گی۔ اس کے علاوہ سڑکوں کی عمومی مرمت، خصوصی مرمت، تعمیر نو وغیرہ کے کام چلتے رہیں گے۔ گزشتہ تقریباً ایک سال کی مدت میں ۱۰۴۸ء کلومیٹر سڑکوں کی تعمیر کا کام مکمل کیا گیا۔سڑکوں کی تعمیر کے ساتھ ساتھ حکومت نے پلوں اور فلائی اوورز کی تعمیر پر بھی خصوصی توجہ دی ہے۔ فی الوقت ۸۶ بڑے پلوں کی تعمیر کا کام تیزی سے مکمل کیا جارہا ہے۔ اس کے علاوہ ۱۸ر پلوں کو اپروچ روڈ سمیت مکمل کرکے عوام کے سپرد کرنے کے لئے تیار کردیا گیا ہے۔اس کے ساتھ ہی ۴۱ ریلوے پلوں کی تعمیر کا کام بھی مکمل کیا جارہا ہے۔اس کے علاوہ ۹ ریلوے پلوں کو اپروچ روڈ سمیت مکمل کرلیا گیا ہے۔چھوٹے پلوں کی تعمیر کا کام بھی تیزی سے جاری ہے۔فی الحال ۴۰ر چھوٹے پلوں کی تعمیر کی جارہی ہے۔ اس کے علاوہ ۱۲ چھوٹے پلوں کی تعمیر کا کام اپروچ روڈ سمیت مکمل کرلیا گیا ہے۔ نابارڈ اسکیم کے تحت ۲۵۰ سے زیادہ آبادی کے ۳۲۶ مواضعات کو جوڑنے کے لئے ۳۵۸ کروڑ روپئے کی لاگت کے راستوں کی تعمیر کے نام کی توثیق کی گئی ہے۔ اس کے علاوہ ۴۵ پلوں کے تعمیراتی کام جن کی لاگت ۱۴۵ کروڑ روپئے ہے، بھی منظور کئے گئے ہیں۔ بیس راستوں کو چوڑا کرنے/مستحکم کرنے کے پروجیکٹ ۳۷۹ کروڑ روپئے اور ۳۴ پلوں کی تعمیر کے پروجیکٹ جن کی لاگت ۹۰۶ کروڑ روپئے ہے۔ان کی منظوری بھی نابارڈ کے زیر غور ہے۔ پنڈت دین دیال اپادھیائے کے جشن صد سالہ کے موقع پر ریاست کے جو مواضعات ابھی تک رابطہ سڑکوں سے نہیں مربوط ہیں انہیں نشانزد کرتے ہوئے پختہ رابطہ سڑکوں سے مربط کرنے کی حکمت عملی بنائی جارہی ہے۔ اس کے علاوہ ریاست کے ۷۵۳ شاہراہوں کو چار لیکن چوڑا کرنے اور ۱۰۱۱۲ کلومیٹر طویل بائی پاس کی تعمیر جن کی لاگت ۲۳۹۹۹ کروڑ روپئے ہے، تکمیل کے مختلف مراحل میں ہیں۔ سال ۲۰۱۹ء کے کمبھ میلے کے لئے کل ۹۳ کاموں کے لئے ۷۵۸ کروڑ روپئے کے پروجیکٹ زیر غور ہیں۔

موجودہ حکومت کا ایک سال مکمل ہونے پر اتر پردیش کے وزیر اعلیٰ یوگی آدتیہ ناتھ جی لوک بھون میں اینٹی کرپشن پورٹل کا افتتاح کرتے ہوئے

محکمہ جاتی کاموں کو تیز رفتار دینے کے مقصد سے وزیر اعلیٰ یوگی آدتیہ ناتھ جی کی سطح سے اعلیٰ سطحی جائزے کے لئے 'سی ایم ڈیش بورڈ' کے نام پر پورٹل تیار کیا گیا ہے جس میں محکمہ کے ذریعہ ریاست میں نئی سڑکوں کی تعمیر، سڑکوں کے رکھ رکھاؤ اور پلوں کی اطلاع ہر ماہ دستیاب کرائی جاتی ہے۔ اس کے علاوہ محکمہ میں ٹینڈر کے عمل کو پورے طور پر شفاف بنانے کے مقصد سے ای ٹینڈرنگ نظام نافذ کیا گیا ہے۔

ریاست کے ترقی بالخصوص صنعتی ترقی اور سرمایہ کاری کے لئے پرامن ماحول انتہائی ضروری ہے اسی لئے حکومت نے لا اینڈ آرڈر پر خصوصی توجہ دی ہے۔ اسی سلسلہ میں سبھی تھانیداروں کو اپنے اپنے حلقوں میں شام کے وقت کم سے کم ایک گھنٹہ فٹ پٹرولنگ کرنے کے احکامات دئے گئے ہیں۔ اس کی تعمیل میں یکم جون ۲۰۱۷ء سے ۲۳ فروری کے درمیان پولیس نے ۹۴۳۰۱ مقامات پر پٹرولنگ کی اور ۴۶۱۱۲۸۴ مشتبہ افراد کو چیک کیا۔ پٹرولنگ کے دوران ۱۵۹۰۷۲ افراد حراست میں لئے گئے، ۸۸۰۹۳ مقدمات درج کر کے ۹۵۹۶۴ ملزموں کو گرفتار کیا گیا۔ مطلوبہ مجرموں کی گرفتاری اور جرائم پر موثر کنٹرول کے لئے ریاست گیر مہم کے دوران پولیس اور مجرموں کے درمیان ۱۲۹۴ تصادم ہوئے جن میں ۳۰۶۵ مجرم گرفتار کئے گئے۔ ۳۲۵ زخمی ہوئے اور ۴۵ مارے گئے۔ مجرموں کی ۳۱ء۱۴۷ کروڑ روپئے کی املاک ضبط کی گئی۔ مجرموں کے خلاف موثر کارروائی کے سبب ۵۴۰۹ مجرموں نے خود ضمانت مسترد کرا کر عدالتوں میں خود سپردگی کی۔ سال ۲۰۱۷ء میں سال ۲۰۱۶ء کے مقابلے میں ریاست میں ڈکیتی میں ۵ء۷۰ فیصد، قتل میں ۷ء۳۵ فیصد، روڈ ہولڈ اپ میں ۱۰۰/فیصد، زرتاوان کے معاملوں میں ۱۳ء۲۱ فیصد اور آتشزنی میں ۲۹ء۳۷ فیصد کی کمی آئی ہے۔ جرائم کو صد فیصد درج کرنے کے لئے سخت احکامات دئے گئے ہیں۔ اس مقصد سے ریاست میں پہلی بار پولیس سپرنٹنڈنٹ کے دفتر میں ایف آئی آر کاؤنٹر کھولے گئے ہیں۔ ریاست کے ہر ضلع میں تشکیل دئے گئے اینٹی رومیو دستوں نے ۹۶۳۵۵۹ مقامات پر ۲۶۳۶۰۷۰/افراد کو چیک کیا، ۱۹۸۷ مقدمات درج کئے اور ۱۳۴۱۸ افراد کے خلاف قانونی کارروائی کی نیز ۱۱۹۴۹۲۱/افراد کو انتباہ دے کر چھوڑ دیا۔ وومن پاور لائن ۱۰۹۰ میں مورخہ ۲۰/مارچ ۲۰۱۷ء سے ۳۱/جنوری ۲۰۱۸ء تک ۱۷۷۵۲۲ شکایتوں کا حل نکال کر متاثرہ خواتین کو راحت پہنچائی گئی۔ پولیس کے ذریعہ موخہ ۱۶/مارچ ۲۰۱۷ء سے ۳۱/دسمبر ۲۰۱۷ء تک غیر قانونی اسلحہ کے خلاف کی گئی۔ کارروائی میں کارخانے میں بنی ۱۰۶ بندوقیں، ۹۷ پستول، ۵۷ روالور، ۴۷ رائفل، ایک ایس ایل آر، ایک کاربائن، ۲۵۶۶۹ کارتوس، ۵۹۵۰ ڈیٹونیٹر اور دیسی ساخت کی ۱۴۱ بندوقیں، ۲۷۳۲ پستول، ۵۲۷ روالو، ۱۰۵ رائفل، تین کاربائن، ۲۱۸ کارتوس، ۱۳۹۲ بم نیز ۱۵۴ اسلحہ کارخانے سے برآمد کئے گئے۔ پولیس اہل کاروں کی فعالیت میں اضافہ کرنے کے مقصد سے مالیاتی سال ۲۰۱۷-۱۸ء میں ۷۹ء۱۰۴ کروڑ روپئے سے ۴۲۲۱ گاڑیاں خریدی گئیں۔ مجرموں کے مقابل پولیس کی فائر پاور بڑھانے کے لئے پولیس فورس کو سبھی ۵۸۵۴۷ تھری ناٹ تھری رائفل کے بدلے انساس رائفل مہیا کرائی گئیں۔

دہشت گردی مخالف دستہ (اے ٹی ایس) کو مستحکم کرنے کے لئے ۳۱۶ نئے عہدے تشکیل کئے گئے نیز آلات کے لئے سال ۲۰۱۸-۱۹ء میں ۵۰ کروڑ روپئے الاٹ کئے گئے ہیں۔ اے ٹی ایس کو زیادہ فعال بانے کے نقطۂ نظر سے ۸۶ نئی گاڑیوں کی خرید کے لئے ۲۴ء۴ کروڑ روپئے کی رقم منظور کی گئی۔ یوپی ۱۰۰ پروجیکٹ میں بڑے پیمانے پر بہتری لانے اور اس میں توسیع کرنے کی اسکیم کے تحت ۱۶۰۰ دوپہیا گاڑیوں کو اس میں شامل کیا گیا۔ ڈائل ۱۰۰ کا ضلع پولیس کے ساتھ بہتر تال میل قائم کئے جانے کے لئے ضلع کے افسروں کے لئے موبائل ایپلی کیشن، ویب ماڈیول وڈیش بارڈ یوپی ۱۰۰ کی گاڑیوں کے گشت کے نظام کی موثر عمل آوری اور نگرانی کے لئے پٹرول مینجمنٹ سسٹم نافذ کرا دئے ہیں۔ یوپی ۱۰۰ کے ساتھ ۱۰۸ ایمبولنس خدمت اور ۱۰۱ فائر بریگیڈ خدمت کے وابستہ کر دئے جانے سے عوام کو الگ الگ فون نہیں کرنا پڑے گا۔ اتر پردیش پولیس کے شہیدوں کو دی جانے والی امدادی رقم کو ۲۰/لاکھ سے بڑھا کر ۴۰ لاکھ کیا گیا اور ان کے والدین کو دی جانے والی رقم کو پانچ

موجودہ حکومت کا ایک سال مکمل ہونے پر 'ایک سال نئی مثال' کی رسم اجراء کرتے ہوئے اتر پردیش کے گورنر جناب رام نائک وزیر اعلیٰ اتر پردیش جناب یوگی آدتیہ ناتھ جی اور نائب وزیر اعلیٰ جناب کیشو پرساد موریہ اور ڈاکٹر دنیش شرما اور دیگر معززین

لاکھ سے بڑھا کر دس لاکھ کیا گیا۔جن سنوائی پورٹل کے توسط سے اب تک موصول ۲۲۳۱۶ شکایتوں کا آن لائن تصفیہ یقینی بنایا گیا۔آراضی مافیاؤں کے خلاف چلائی گئی مہم کے تحت اب تک ۱۵۳۱ آراضی مافیاؤں کونشانزد کرکے ان کے خلاف مختلف دفعات کے تحت ۲۵۹۶ مقدمے رجسٹر کئے گئے جس میں ۱۹۲۲ مجرموں کی گرفتاری، ۴۶۰ حاضر عدالت اور چھ کی قرقی کی گئینیز ۴۵ء۷ کروڑ روئے کی غیر قانونی املاک ضبط کی گئی۔

موجودہ حکومت کی توجہ بیسک ایجوکیشن پر بھی خاص ہے۔حکومت نے اس میں کئی بنیادی قدم اٹھا کر بیک ایجوکیشن کو اور زیادہ کارآمد بنا دیا ہے۔ درجہ یکم سے ہشتم تک پرائمری اسکولوں میں بچوں کے اندراج میں قابل ذکر اضافہ ہوا ہے۔ امسال ایک کروڑ ۲۵ لاکھ ۲۲ہزار بچو کا اندراج کرایا گیا۔ ۱۵۸۸۳۷/ اسکولوں مین امسال کل ۱۵۴۲۲۰۴۷ بچوں کا داخلہ کرایا گیا جو کہ گزشتہ برس سے تقریباً دو لاکھ زیادہ ہے۔ سبھی سرکاری اور امداد یافتہ اسکولوں میں درجہ یکم یا ہشتم کے طلبہ و طالبات کومفت دی جانے والی یونیفارم کی ڈزائن اور رنگ تبدیل کرتے ہوئے اسے جاذب نظر بنایا گیا۔ تقریباً ۶۷ء۱ کروڑ طلبہ و طالبات کومفت یونیفارم مہیا کرائی گئی۔اس کے ساتھ ہی ان طلبہ و طالبات کومفت سویٹر بھی مہیا کرائے۔ ریاست کے ہراسکول میں 'ماں ابھیان' کمیٹی کی تشکیل کرتے ہوئے مڈ ڈے میل کی کوالٹی یقین بنائی جارہی ہے۔ سرکاری اپر پرائمری اسکولوں میں سب کے لئے تعلیم مہم کے تحت کمپیوٹر مہیا کرائے جارہے ہیں۔تعلیم کے زمرے میں حکومت نے سب سے اہم قدم یہ اٹھایا ہے کہ ۱۰۷۶۸ اساتذہ کی تقرری کا عمل شروع کرادیا ہے۔

یوگی حکومت صحیح معنوں میں سب کا ساتھ سب کا وکاس کے نعرے پر عمل کرتے ہوئے کمزور، پسماندہ، درج فہرست اقوام وقبائل اور اقلیتوں کی ترقی اور بہبود پر مساوی طور سے کام کررہی ہے۔اقلیتوں کی کثرت والے پسماندہ علاقوں میں بہتر طبی سہولیات مہیا کرانے کے پیش نظر ۲۸/ابتدائی ذیلی صحت مراکز، ایک کمیونٹی صحت مرکز، چار ابتدائی صحت مراکز اور چھ آیوش اسپتالو کی تعمیر کا اکام مکمل کرایا گیا۔ملٹی سیکٹورل ڈولپمنٹ پلان کے تحت تعلیمی سہولیات کی فراہمی کے مقصد سے ۴۵ انٹر کالجوں کی تعمیر کا کام مکمل کرایا گیا اور ہنرمندی کے فروغ کے لئے ۲۲ نئی آئی ٹی آئی عمارتوں کی تعمیر پوری کرائی گئی۔ اسی پلان کے تحت پینے کے پانی اور ہنرمندی کے فروغ سے متعلق بنیاد سہولیات کی ترقی کے لئے یوم اتر پردیش پر پانچ انٹر کالج کالجوں، چار ابتدائی ذیلی صحت مراکز، ۲۸/پینے کے پانی کے پروجیکٹ اور ۲۳/آنگن واڑی مراکز کا سنگ بنیاد رکھا گیا۔اس کے علاوہ ۳۴۸ آنگن واڑی مراکز کی تعمیر مکمل کرا کر بچوں کی صحت اور تغذیہ پروگرام میں مدد کی گئی۔ ریاست میں ۱۹۱۲۳ مدرسے مدرسہ تعلیمی بورڈ میں رجسٹرڈ ہیں۔حکومت فکرمند ہے کہ ان مدرسوں میں جدید مضامین کو بھی پڑھایا جائے تاکہ مسلم طبقے کے بچو کو جدید تعلیم مل سکے۔شفافیت، تعلیم کے معیار میں بہتری، ضابطوں میں آسانی پیدا کرنے کے مقصد سے محکمہ اقلیتی بہبود کی جانب سے مدرسہ پورٹل لانچ کیا گیا ہے۔ مدرسوں میں تعلیم کے معیار میں بہتری لانے کے مقصد سے این سی ای آر ٹی کا نصاب سلسلہ وار نافذ کرکے کا فیصلہ کیا گیا ہے۔ پورٹل اور آن لائن اسکیموں کی عمل آوری سے بورڈ کے کاموں میں شفافیت بہم پہنچانے کے لئے مسلسل کوشاں ہے۔اسی سلسلہ میں سروجنی نگر کے حج ہاؤس کے کمروں اور ہالوں میں اے سی لگائے گئے ہیں تاکہ عازمین کو ٹھہرنے اور آرام کرنے میں دشواری نہ ہو۔اس کے علاوہ حج ۲۰۱۸ء سے عازمین کو گھر بیٹھے آن لائن درخواست دینے کی سہولت مہیا کرائی گئی ہے۔اس سے عازمین حج کو حج کمیٹی کے چکر نہیں لگانے پڑیں گے۔

موجودہ حکومت کا ایک سال مکمل ہونے کے موقع پر اتر پردیش کے وزیر اعلیٰ یوگی آدتیہ ناتھ جی لوک بھون میں پروگرام کو خطاب کرتے ہوئے

خواتین اور اطفال بہبود کے لئے بھی موجودہ حکومت سرگرم ہے۔خواتین کے تحفظ کے لئے حکومت نے متعدد قدم اٹھائے ہیں۔اس کے تحت ۱۸۱ خاتون ہیلپ لائن اور ریسکیو وین خدمات میں توسیع کرکے اسے گیارہ اضلاع سے بڑھا کر سبھی ۷۵ اضلاع میں کیا گیا۔ ہیلپ لائن کے کال سینٹر کی صلاحیت چھ سینٹر سے بڑھا کر ۳۰ سینٹر فی شفت کی گئی۔اس کے بعد اس میں ایک لاکھ تین ہزار ٹیلیفون کال ریسیو کی گئیں جس میں ۲۲ ہزار خواتین کو ریسکیو اور سائٹ کاؤنسلنگ نیز ۷۸ ہزار خواتین کو ٹیلی کاؤنسلنگ کے ذریعہ مدد دی گئی۔ ریاست میں پہلی بار مختلف تعلیمی بورڈوں کی میرٹ میں سے پہلی دس

پوزیشن حاصل کرنے والے کل ۷۴۱ طلبہ وطالبات کو ایک لاکھ کے انعام سے نوازا گیا۔

شوہر کے انتقال کے بعد بے سہارا خواتین کو پنشن اسکیم کے تحت درخواست دینے کی کاروائی پہلی بار آن لائن کی گئی۔ مستفیدین کی زیادہ سے زیادہ عمر کی حد ختم کی گئی۔ اس کے ساتھ ہی ان کی اہلیت کی آمدنی کی حد دو لاکھ روپئے کی گئی۔ سبھی بے سہارا کواتین کو اہل مانا گیا خواہ ان کے بیٹے بالغ ہوں یا نابالغ ہوں۔ اضلاع میں پنشن کیمپ لگا کر ۵ء۶۴ لاکھ نئے مستفیدین سے آن لائن درخواست فارم مکمل کرائے گئے۔ سال ۲۰۱۷-۱۸ء میں دو لاکھ نئے مستفیدین کو پنشن منظور کی گئی۔ سال ۲۰۱۶-۱۷ء کے کل بجٹ ۶۴۷ کروڑ کو بڑھا کر سال ۲۰۱۷-۱۸ء میں اسے ۱۲۶۳ کروڑ کیا گیا۔ رانی لکشمی بائی خواتین اوراعزاز واطفال فنڈ کے تحت مالیاتی سال ۲۰۱۷-۱۸ء میں ۱۴۳۵ خواتین کو ۵۳ء۶۴ کروڑ روپئے کی رقم مہیا کرائی گئی۔

لکھنؤ کے ڈاکٹر رام منوہر لوہیا اسپتال میں ہیلپ ڈیسک قائم کی گئی۔ اس کے ساتھ ہی مفت علاج کے لئے ۲۵ لاکھ روپئے کی امپرسٹ منی مہیا کرائی گئی۔ ریاست میں پہلی بار تقریباً دو ہزار گاؤں/ پنچایتوں میں حقوق خواتین و اطفال منچ تشکیل دیا گیا۔ بزرگوں کو ۲۸ء۱۶۷۲۲ لاکھ روپئے کی پنشن جاری کی گئی۔ اس کے علاوہ معذور افراد کے گزر بسر کی رقم کو ۳۰۰ روپئے سے بڑھا کر ۵۰۰ روپئے کیا گیا۔

ریاستی حکومت نے ۳۶۰۰۰ کروڑ روپئے سے ۸۶ لاکھ چھوٹے اور مارجنل کسانوں کو قرض سے نجات دلائی۔ گنا کسانوں کو ۲۷۰۰۰ کروڑ روپئے کے گنے کی قیمت کے بقایاجات کی ادائیگی کی۔ کسانوں سے ۳۷ لاکھ میٹرک ٹن گیہوں کی ریکارڈ خرید کی گئی جو گزشتہ سال سے ۵ء۴ گنا زیادہ ہے۔ اس کے ساتھ ہی کسانوں سے ۴۲ء۵۴ لاکھ میٹرک ٹن دھان کی خرید کی گئی جس کے لئے ۱۲۶۲۰ کروڑ روپئے کی ادائیگی کی گئی۔ آئندہ فصل کے لئے گیہوں کی کم از کم سہارا قیمت ۱۷۳۵ روپئے کی کوئنٹل طے کی گئی۔

حکومت اتر پردیش نے ریاست کے دو لاکھ سے زیادہ نوجوانوں کو روزگار کی تربیت دلا کر پلیسمنٹ کرایا۔ اس کے علاوہ روزگار میلوں میں ۱۳۳۲۶ نوجوانوں کو تقرری نامے تقسیم کئے گئے۔ ہر ضلع کی خصوصی پیداوار کی حوصلہ افزائی کے لئے ایک ضلع ایک پیداوار اسکیم نافذ کی گئی۔ حکومت نے یوپی انوسٹرس سمٹ-۲۰۱۸ء کا کامیاب انعقاد کیا جس کے نتیجے میں ۴ء۷۰ لاکھ کروڑ روپئے کی سرمایہ کاری کی تجاویز موصول ہوئیں۔ سرمایہ کاروں کو سہولت دینے کے مقصد سے سنگل ونڈو کلیئرنس ڈپارٹمنٹ کا قیام اور نویش اور نویش مترسنگل ونڈو ویب پورٹل شروع کیا گیا۔ حکومت کی کوششوں سے ریاست کے دس شہر اسمارٹ سٹی پروگرام کے لئے منتخب کئے گئے۔ لکھنؤ میٹرو کے پرائمری سیکشن پر میٹرو ریل کا آغاز کیا جاچکا ہے۔ اس کے علاوہ غازی آباد میٹرو ریل کی توسیع کی گئی۔ کانپور، آگرہ، میرٹھ کا ڈی پی آر منظوری کے لئے ارسال کر دیا گیا ہے۔ گورکھپور، وارانسی، الٰہ آباد کے لئے ڈی پی آر تیار کر لیا گیا ہے۔ سوچھ بھارت مشن کے تحت ۴۳۲۲۰۱ اجابت گھروں اور کمیونٹی اجابت گھروں کی گیارہ ہزار سیٹوں کی تعمیر کی گئی۔ دیہی علاقوں میں ۳۹ لاکھ اجابت گھروں کی تعمیر کی گئی۔ ریاست کے آٹھ اضلاع کھلے میں اجابت کرنے سے پاک کئے گئے۔ ریاستی حکومت نے طب وصحت پر خصوصی توجہ کی ہے۔ ریاستی عوام کو بہترین طبی سہولتیں مہیا کرانے کے مقصد سے ۱۵۰ ایڈوانس لائف سپورٹ سسٹم سے آراستہ ایمبولنس چلائی جارہی ہے۔ ۹۲ لاکھ بچوں کو اے سی ایس/ جے ای سے بچانے کے لئے ٹیکے لگائے گئے۔ ریاست کے آٹھ اضلاع میں نئے میڈیکل کالج کی منظوری دی گئی۔ اس کے علاوہ ۶۲ ضلع خاتون اسپتالوں اور میڈیکل کالجوں میں نیوبارن کیئر یونٹ قائم کئے گئے۔ گورکھپور میں ایمس کی تعمیر کا کام شروع کیا جاچکا ہے۔ منطقائی اور ضلع اسپتالوں میں ڈائلسس خدمات شروع کی جاچکی ہیں۔

موجودہ حکومت کا ایک سال مکمل ہونے کے موقع پر اتر پردیش کے گورنر جناب رام نائیک اور وزیر اعلیٰ یوگی آدتیہ ناتھ جی لوک بھون میں کلچرل گروپ کے ساتھ

مختصر یہ کہ ریاستی حکومت نے غنڈوں اور بدعنوانوں پر قابو پا کر سماج کے سبھی طبقوں، کسانوں، کھیت مزدوروں، خواتین اور نوجوانوں کے مفاد میں متعدد قدم اٹھائے ہیں۔ شفاف ورک کلچر سے تشکیل پائے معقول اور مثبت ماحول سے ریاست کو بڑی سرمایہ سرکاری کی تجاویز موصول ہوئی ہیں جن پر عمل آوری سے نوجوانوں کو روزگار کے کافی مواقع ملیں گے اور ریاست کی ہمہ جہت ترقی کے نئے دور کا آغاز ہوگا۔

❑❑❑

پروفیسر بیگ احساس کے افسانے پڑھ کر ایک الگ قسم کا احساس ہوتا ہے۔ موضوع اور اسلوب کی انفرادیت انھیں دیگر افسانہ نگاروں کی بھیڑ سے الگ کرتی ہے۔ موضوعاتی سطح پر وہ زیادہ تر مقامی اور اردگرد کے مسائل کا انتخاب کرتے ہیں لیکن اتنی خوبصورتی، فنی چابک دستی اور تخلیقی رچاؤ سے ان کو حیطۂ تحریر میں لاتے ہیں کہ ان کی مقامیت آفاقیت میں تبدیل ہوجاتی ہے۔ جدیدیت کے دور میں ادب کے میدان میں قدم رکھنے والے بیگ احساس نے حقیقت پسندی سے کام لیتے ہوئے کسی بھی قسم کی ادبی انتہا پسندی سے گریز کیا ہے۔

زیر تبصرہ کتاب 'دخمہ' بیگ احساس کا تازہ ترین افسانوی مجموعہ ہے۔ اس سے قبل ان کے دو افسانوی مجموعے 'خوشۂ گندم' اور 'حنظل' منظر عام پر آچکے ہیں۔ ان کے افسانوں کی زبان آسان لیکن نام عموماً مشکل ہوتے ہیں۔ غالباً قاری کی توجہ مبذول کرانے کے لئے وہ ایسا کرتے ہیں یا پھر وہ چاہتے ہیں کہ قاری ان کے افسانے پڑھتے وقت ایک دو بار ضرور لغت دیکھے تاکہ اس کے علم میں اضافہ ہو۔ اس حقیقت کا اعتراف کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں کہ لفظ 'دخمہ' خود راقم کیلئے نیا تھا اور ڈکشنری دیکھنے پر مجبور ہوا۔ دخمہ پارسیوں کے قبرستان کو کہتے ہیں۔ افسانوی مجموعہ 'دخمہ' میں کل گیارہ افسانے شامل ہیں۔ افسانوں کے عنوان یہ ہیں۔ سنگ گراں، کھائی، چکرویوہ، درد کے خیمے، سانسوں کے درمیان، نجات، دھار، شکستہ پر، دخمہ، نمی دانم کہ۔۔۔۔ اور رنگ کا سایہ۔

مذکورہ افسانوں کو پڑھ کر یہ اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ بیگ احساس کو زبان و بیان پر قدرت حاصل ہے۔ کردار نگاری، جزئیات نگاری اور جذبات نگاری غضب کی ہے۔ کرداروں کی سائیکی کا بڑا گہرا علم ہے۔ اس کے علاوہ رفتار زمانہ پر پینی نظر، تاریخی، سیاسی، مذہبی اور معاشرتی مسائل کا عرفان، نفسیاتی معاملات کا ادراک اور اپنی ذمہ داریوں کا بخوبی احساس ہے۔ ان کی ہر کہانی کا موضوع الگ ہے۔ انھوں نے اپنے آپ کو کہیں دہرایا نہیں ہے۔ دخمہ میں اخلاقی قدروں کے زوال، رشتوں کی شکست وریخت، تہذیبوں کے ٹکراؤ، جنریشن گیپ کے مسائل، تصوف کی پر اسرار دنیا، تاریخ سے چھیڑ چھاڑ، مذہبی انتہا پسندی، ملک میں پھیلتی فرقہ پرستی اور رواداری کے روبہ زوال ہونے کے المیاتی بیان کے ساتھ ساتھ خوبصورت رومان پرور فضا بھی دیکھنے کو ملتی ہے۔ اس 'رند پارسا' کے یہاں شراب کی خصوصیات اور شباب کی جمالیات کا ذکر جمیل بھی ملتا ہے۔ اور ان سب کو ایسے اچھوتے انداز اور فکری گہرائی کے ساتھ پیش کیا ہے کہ قاری افسانہ ختم کرنے کے بعد بھی دیر تک سوچنے پر مجبور ہوجاتا ہے۔ نادر تشبیہات واستعارات اور نئی علامتوں کے برمحل استعمال سے افسانوں کا حسن مزید نکھر گیا ہے۔ موضوعاتی اور اسلوبیاتی بوقلمونی کو دیکھتے ہوئے بیگ احساس کی ادرا کی قوت، فنی رچاؤ اور تخلیقی حسن کا قائل ہونا پڑتا ہے۔ انھوں نے تقریباً ہر افسانے میں نئی تکنیک کا استعمال کیا ہے۔ ہر کہانی کے لئے نئے پلاٹ پر نئی اور منفرد عمارت کھڑی کی ہے۔ بعض افسانوں میں 'شعور کی رو' تکنیک کا استعمال کیا ہے۔ جس زمانے میں یہ الزام عائد کیا جارہا تھا کہ کہانی سے کہانی پن اور بیانیہ غائب ہوتا جارہا ہے، پروفیسر بیگ اس تاثر کو رد کرتے ہوئے اپنی کہانیوں میں کہانی پن اور بھرپور بیانیہ واپس لائے۔ بیگ احساس کا بیانیہ دلچسپ اور رس دار ہونے کے ساتھ فکر انگیز بھی ہے۔ جگہ جگہ آبدار اور فکر انگیز جملے پڑھنے کو ملتے ہیں۔ مثلاً افسانہ 'دخمہ' کے یہ جملے ملاحظہ فرمائیں:

''اپنی مستحکم تہذیب کی بنیاد پر ریاست کے یہ حصے ٹاٹ میں مخمل کے پیوند لگتے تھے... جس شہر کی تاریخ نہیں ہوتی اس کی تہذیب بھی نہیں ہوتی۔۔۔۔ دو تہذیبوں نے الگ الگ جزیرے بنالئے تھے''۔

اس کے علاوہ افسانہ 'شکستہ پر' کا ایک رومانی منظر بھی دیکھئے:

''سمن تازہ دم تھی اور مسلسل سمیر پر حملہ کررہی تھی۔ سمیر نے سشما پر پانی اڑانا بند کیا تو اس کی نظر سمن پر پڑی۔ وہ بری طرح چونکی۔ اف وہ بدن ایک مکمل جوان لڑکی کا تھا۔ سمن کے اندر اتنی خوبصورت لڑکی چھپی ہے، اسے پتہ ہی نہ تھا۔ سمن کے کپڑوں سے بدن کی تیز کرنیں پھوٹ رہی تھیں۔ سشما کی آنکھیں چندھیا گئیں۔ اسے صرف دو چمکتے سورج ہر طرف دکھائی دینے لگے۔ اسے شدید احساس کمتری ہونے لگا۔ اس کا بدن تو مکمل ہوگیا تھا۔ لیکن تکمیل کے مراحل طے کرنے والا بدن کتنا خطرناک ہوتا ہے، اسے پہلی بار احساس ہوا۔ اس نے سچے دل سے دعا کی کہ سمیر کی نظر سمن پر نہ پڑے۔ وہ سمیر کی نظر کو جانتی تھی''۔

بیگ احساس نے اپنے افسانوں میں مقامی زبان تیلگو وغیرہ کا بھی استعمال کیا ہے۔ اسی طرح حیدرآبادی اردو کی خصوصیات بھی نظر آتی ہیں۔ حیدرآبادی لہجے میں بہت سے الفاظ میں الف بڑھا کر لکھا جاتا ہے۔ جیسے بہنوئی کی جگہ بہنوائی، پیک کی بجائے پیاک، چینل کی جگہ چیانل، رتھ کی بجائے راتھ، چیرٹی کی جگہ چیارٹی، ریلی کی بجائے ریالی وغیرہ۔ اس کے علاوہ برخاست کو برخواست، حالت کی جگہ موقف، اسپتال کی بجائے دواخانہ، داخل کی جگہ شریک اور عہدے کی بجائے جائیداد استعمال ہوتا ہے۔ یہ لسانی خصوصیت پروفیسر بیگ کے افسانوں میں بھی پائی جاتی ہے۔

ان کے موضوعات بظاہر عام لیکن درحقیقت بہت خاص ہوتے ہیں۔ تاریخ، عمرانیات، لسانیات اور نفسیات کے علم کے بغیر ان کے افسانوں کو سمجھنا بہت مشکل ہے۔ اسی طرح اسلوب کے اعتبار سے ان کے افسانوں کو دیکھیں تو آسان اور سادہ بیانیہ نظر آتا ہے۔ لیکن بالکل سپاٹ بیانیہ نہیں ہے۔ اکہرا اور بے رس بھی نہیں ہے۔ بلکہ ان کے اسلوب کی سادگی میں پرکاری ہے۔ چھوٹے چھوٹے جملوں میں بڑی بڑی باتیں کہہ جاتے ہیں۔ زبان میں علاقائیت کا رنگ ضرور جھلکتا ہے لیکن موضوع کے تقاضے، کرداروں کی زبان اور پس منظر کے پیش نظر وہ گراں نہیں گذرتا۔ اردو نثر میں اگر 'سہل ممتنع' کا وجود ہے تو میں کہوں گا کہ ان کے افسانے سہل ممتنع کی بہترین مثال ہیں۔

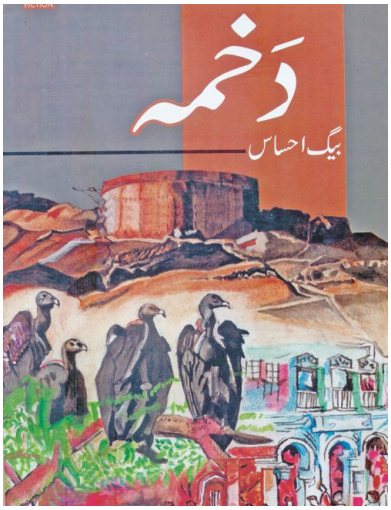

مصنف : بیگ احساس
مبصر : وصی اللہ حسینی
قیمت : ۲۰۰ روپئے
ناشر : عرشیہ پبلی کیشنز، نئی دہلی
ملنے کا پتہ : مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ، اردو بازار، جامع مسجد، دہلی

مجموعی اعتبار سے افسانوی مجموعہ 'دخمہ' خرید کر پڑھنے اور اپنے کتابی ذخیرے میں رکھنے کے لائق ہے۔ کتاب کے شروع میں پاکستان کے ممتاز فکشن نگار اور نا قدمرزا حامد بیگ کا گراں قدر مقدمہ ہے۔ طباعت اور کاغذ بھی عمدہ ہے۔ کہیں کہیں پروف کی غلطیاں ہیں لیکن انھیں گوارا کیا جاسکتا ہے۔ ادبی دنیا کو ایک اچھا تخلیقی تحفہ دینے پر بیگ احساس کو تہہ دل سے مبارک باد!!!

□□□

ڈاکٹر معظم علی خاں اردو نظم کے ایک معتبر اور معروف شاعر ہیں۔ ''رقص صدا'' ان کی پابند نظموں کا تازہ مجموعۂ کلام ہے، جس میں نظم کی مختلف ہیئتوں کے ذریعہ شاعر نے اپنے مافی الضمیر کا بڑی خوبصورتی کے ساتھ اظہار کیا ہے، جس میں وہ پوری طرح کامیاب ہیں۔ اس سے قبل بھی موصوف کا ایک مجموعۂ کلام ''حرف آئندہ'' منصۂ شہود پر آ کر اہل نظر سے خراج تحسین وصول کر چکا ہے۔

''رقص صدا'' کی نظموں میں سماجی، تہذیبی، سیاسی اور مذہبی افکار کو بڑی خوبصورتی کے ساتھ نمایاں کیا گیا ہے۔ ان نظموں کے ذریعہ قومی یکجہتی، انسان دوستی اور اخوت کا جو پیغام شاعر سماج کو دینا چاہتا ہے اس میں وہ پوری طرح کامیاب ہے۔ معظم علی خاں کے شعری اسلوب میں تازگی اور سستگی ہے، لفظوں کے استعمال میں سلیقہ اور مشاقی ہے جو ان کے فنکارانہ محنت، شاعرانہ بصیرت اور زبان و بیان پر اس کی دسترس کا مظہر ہے۔ ''رقص صدا'' میں شامل نظموں میں اسلامی تاریخ کو بھی موضوع بنایا گیا ہے، عشقیہ جذبات کی بھی عکاسی کی گئی ہے اور سماجی سروکاروں کو بھی اس میں جگہ دی گئی ہے۔ ساتھ ہی قومی رہنماؤں کے منظوم خاکے بھی اس میں شامل کیے گئے ہیں۔ مجموعۂ کلام میں شامل نظمیں، قوم وملت کی خستہ حالی اور تباہی داستان بھی ہیں اور ان نظموں میں پند و نصائح کی جانب بھی توجہ دی گئی ہے۔ ان نظموں کے مطالعے کے بعد ذہن میں جو فضا تشکیل پاتی ہے، وہ ایک صالح سماج کی طرف قاری کو متوجہ کرتی ہے۔

مجموعہ کلام کے ابتدائی حصے میں اسلم حنیف صاحب اور پروفیسر وحید الظفر خاں صاحب کے ''رقص صدا'' کے حوالے سے افکار و نظریات ہیں تو ''اپنی بات'' کے ذریعہ خود شاعر موصوف نے پابند نظموں کے حوالے سے اپنے مطمع نظر کو واضح کرنے کی کوشش کی ہے۔ کلام کی ابتدا حسب روایت جہاں مناجات اور نعت کے ذریعہ کی گئی ہے وہیں حج بیت اللہ اور زیارت مدینہ منورہ کا آنکھوں دیکھا حال بھی نظم کیا ہے۔ خانہ کعبہ اور روضۂ رسول کے سامنے ہونے والی کیفیت کو بھی اس قدر خوبصورتی کے ساتھ نظم کیا ہے کہ ہر مسلمان جہاں اس کیفیت کو اپنے دل میں محسوس کرتا ہے بلکہ اس کا دل بھی از خود وہاں جانے کے لیے بے چین ہو اٹھتا ہے۔ ''اندھیرے سے اجالے تک'' ایران میں انقلاب کے حوالے سے ایک اچھی نظم ہے۔ اسی طرح ''جشن پاکیزہ'' بھی ایک خوبصورت اور نصیحت آمیز نظم ہے۔ بعد ازاں ''تاج محل'' کی خصوصیات پر روشنی ڈالی گئی ہے تو وہیں نظم ''عورت'' کے ذریعہ اس کے مختلف روپ دکھائے گئے ہیں۔ ''علی گڑھ کی آزاد لائبریری'' کے حوالے سے ایک مضبوط نظم ہے۔ نظم ''اردو'' میں شاعر نے یہ بتانے کی کوشش کی ہے ؎

میں نے ہی انقلاب کا نعرہ عطا کیا
بسمل سا اہل ہند کو اک سورما دیا

غرض کہ پوری نظم میں جہاں اردو زبان کے اوصاف نظم کیے گئے ہیں وہیں شاعر موصوف نے بڑی خوبصورتی کے ساتھ اردو کے ذریعہ ایک مضبوط شکایت بھی درج کرائی ہے۔

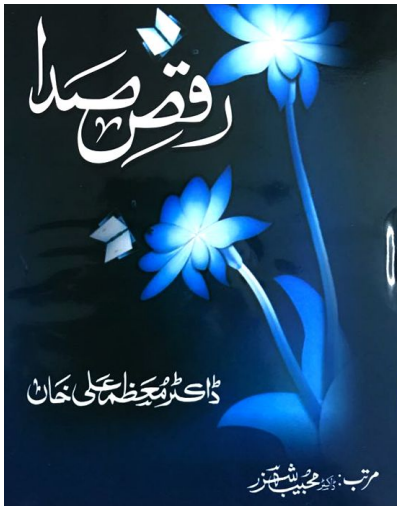

مصنف : ڈاکٹر معظم علی خاں
مبصر : ڈاکٹر ذکی طارق
قیمت : 400 روپئے
ناشر : ایم ایس پرنٹرس، علی گڑھ
ملنے کا پتہ : 4/8، زہرہ باغ، علی گڑھ

''طلسم زندگی''، ''آبروئے ادب''، ''نفس امارہ''، ''دوستی کے بڑھتے قدم''، ''ہولی ملن''، ''تضاد''، ''کل شب''، ''خیر مقدم''، ''یہ زلزلہ نہ تھا''، ''قومی ترانہ''، ''زندگی اور موت''، ''تنہائی'' وغیرہ بڑی مرصع اور خوبصورت نظمیں ہیں۔ ت

''تعبیر خواب'' ایک ایسی نظم ہے جس میں شاعر خواب دیکھتا ہے کہ اگر ہمیں آزادی مل جائے تو یہ ملک جنت بن جائے گا۔ چہار جانب ہریالی ہوگی۔ عوام کے چہروں سے خوشحالی جھلک رہی ہوگی۔ مگر آزادی کے 67 برس بیت جانے کے باوجود وہ آزادی ہمیں میسر نہیں آئی جس کا خواب شاعر نے دیکھا تھا۔ تعصب، تنگ نظری، غربت، رشوت خوری، فواحشی اور بدامنی نے اپنی جڑیں اس طرح مضبوط کر لی ہیں کہ انسان گھر میں بیٹھ کر بھی خود کو تنہا محسوس کر رہا ہے اور شاعر اپنے نظم میں کہہ اٹھتا ہے کہ

ہمیں آزاد رہنے کا ہنر اب تک نہیں آیا

شاعر نے سماج میں رونما ہونے والی مختلف برائیوں کا تذکرہ بڑی خوبی کے ساتھ نظم کرتے ہوئے اُن آرزوؤں اور تمناؤں کا ذکر کیا ہے جو اس کے ذہن میں خواب دیکھتے ہوئے آئی تھیں، لیکن خواب کی تعبیر نہ ملنے پر شاعر شکوہ کرتا ہے ؎

لیکن سارے خواب ہمارے یکسر چکنا چور ہوئے
وقتِ سحر جب آنکھ کھلی تو دیدہ و دل رنجور ہوئے

اور اسی دیدہ و دل رنجور ہونے پر شاعر اپنی نظم ''اندیشہ'' میں رطب اللسان ہے

ظلم ہے ہر سوچ کی دہلیز پر جلوہ فگن
عام ہوتا جا رہا ہے اب برائی کا چلن
بے حقیقت سا نظر آتا ہے آزادی کا روپ
پیار کی دیوار پر چڑھنے لگی نفرت کی دھوپ

معظم علی کے قلب و ذہن نے اپنی نظموں میں جس حسن پرستی اور عشقیہ جذبات کا اظہار کیا ہے اس میں ہوس پرستی کا شائبہ تک نہیں، بلکہ وہ شاعر کے سچے جذبے اور صالح اقدار کی غمازی کرتی ہیں۔ ''زندگی اور موت'' میں زندگی اور موت کے فلسفے کو سمجھانے کی کوشش کی ہے۔ ''قومی ترانہ'' میں وطن کی عظمت بیان کرتے ہوئے شاعر یہ عہد کرتا ہے کہ دشمن کی ناپاک سازشوں سے اس کی حفاظت کریں گے۔

''رقص صدا'' میں شامل نظموں کے مطالعے کے بعد یہ بات پورے وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ معظم علی خاں نے عشق کی سرگوشیوں اور ہجر کی سسکیوں کو ہی سطحی طور پر نظم نہیں کیا ہے بلکہ ان نظموں میں سماج میں ہونے والی خرابیوں کے خلاف ایک احتجاج کی آواز صاف محسوس کی جا سکتی ہے۔ طوالت کے پیش نظر نظموں سے مثال پیش کرنا ایک دشوار امر ہے، اس کے مطالعے سے قاری از خود شاعر کے تخلیقی مزاج، اُس کے فکر و نظر کی کشادگی اور دل پذیر لہجے کو محسوس کرتے ہوئے ہمارے قومی رہنماؤں کے جو منظوم خاکے مجموعے کی زینت بنے ہیں یقیناً داد دیئے بغیر نہیں رہ پائے گا۔

□□□

'نیادور' ہندوستان کے بیشتر اہم شہروں کی ایجنسیوں پر دستیاب ہے۔ ایجنسیوں کی فہرست شائع کی جارہی ہے۔

'نیادور' ماڈرن بک ڈپو، جن پتھ، حضرت گنج میں بھی دستیاب ہے۔

۱	**محمد نعیم** دانش محل، سنٹرل ہوٹل، مقابل زیرزمین پارکنگ، امین آباد، لکھنؤ Mo.9792361533
۲	**مولانا محمد وکیل ندوی** علامہ شبلی لائبریری، دارالعلوم ندوۃ العلماء ٹیگور مارگ، ڈالی گنج، لکھنؤ۔226007
۳	**سید محمد سرور** عرش ایسوسی ایٹس، خواجہ ٹاور، نزد وی مارٹ وکٹوریہ اسٹریٹ، نخاس، لکھنؤ
۴	**مولانا اسیف جائسی** نورِ ہدایت فاؤنڈیشن، اماماڑہ، غفرآنماب چوک، لکھنؤ 8736009814
۵	**ادارۂ تنظیم المکاتب** ریڈ گیٹ بلڈنگ، جگت نارائن روڈ، نزد گلاب سنیما، گولہ گنج، لکھنؤ

ہندوستان کے دیگر شہروں کی ایجنسیاں

۱	جناب اسد یار خان ایجوکیشنل بک ہاؤس، شمشاد مارکٹ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ۔ 202002 موبائل۔96341 05087
۲	جناب طالب حسین ایف۔ڈی۔انٹر کالج، کاٹھ دروازہ، مرادآباد۔ 244001، یوپی۔ موبائل۔098372 25809
۳	ڈاکٹر نہال رضا یوتھ فیڈریشن، عسکری کلینک، محلہ قاضیانہ، پوسٹ ردولی ضلع فیض آباد۔ 224120 موبائل۔94151 52710
۴	جناب علی حسین ادریسی ادریسیہ بک سینٹر، نیوز پیپر ایجنٹ، سنگت کلا، غازی پور سٹی۔ 233001 یوپی موبائل۔93693 05266 .
۵	جناب محمد بدرالدین ناولٹی بکس، علامہ اقبال چوک قطعہ گھاٹ، دربھنگہ۔ بہار . 846004
۶	جناب زکریہ ایاز ۱، پریم نگر، اورئی، جالون موبائل۔ 9452452788
۷	جناب ایتاز انور بک امپوریم، اردو سبزی باغ پٹنہ۔800004 موبائل۔93048 88739
۸	جناب ضمیر احمد ضمیر بک ڈپو، قطب شیر، سہارنپور۔ یوپی . 098971 08075
۹	جناب روشن صدیقی ناصر لائبریری، ابو بازار اونچوا۔ گورکھپور۔(U.P.) 273001 9451846364
۱۰	ڈاکٹر شکیل احمد قاسم منزل، ڈومن پورا، چنگی مؤناتھ بھنجن۔ 275101 - Mo. 92367 22570
۱۱	جناب ایس۔ایم۔عباس ایڈوکیٹ ۸۸، تارتلہ، جونپور۔ 222001- Mo. 98380 81405
۱۲	جناب بھوانی پرساد گپتا، 'ویدھ' سابق نامہ نگار، 'ترون بھارت' اترولہ، بلرامپور (U.P.) 271604
۱۳	میسرس کمالیہ بک ڈپو تاتارپور، بھاگلپور۔ بہار، 812002 Mo. 93341 90757
۱۴	جناب کامل مجید محلہ چاہ میر، مقابل نواب دولہے کی کوٹھی، بدایوں Mo. 94102 93406
۱۵	جناب ساغر وارثی ایمن زئی، جلال نگر، شاہجہانپور Mo. 93691 90785
۱۶	میسرس انیس بک ڈپو ۷/۱، محلہ۔آٹالہ، الہٰ آباد۔ Mo. 93351 68463
۱۷	جناب عباد احمد ایڈوکیٹ جج صاحب کا پھاٹک، مولوی ٹولہ فانی روڈ، بدایوں۔243601 Mo. 94124 08110
۱۸	عارف علی بک سیلر لطیف مارکٹ، خیرآباد ضلع سیتاپور۔261131(U.P) Mo. 93363 04064
۱۹	جناب ایس۔عزاز دار حسین نقوی ۶۰/۲۵، حضرت گنج،، دریاباد الہٰ آباد(U.P) 211003 Mo. 99198 16295
۲۰	میسرس پوجا پستک بھنڈار سرائے میر، اعظم گڑھ۔276305 Mo. 94510 39177
۲۱	میسرس ہمدم بک اسٹال، مبارک پور اعظم گڑھ، 92362 72662
۲۲	جناب محمد سلیم (جنرلسٹ) پیر بٹاون (پھلواری)، بارہ بنکی Mo. 94157 74724
۲۳	میسرس نظامی بک ایجنسی (نظامی پریس) محلہ۔سوتھا، شکیل بدایونی روڈ، بدایوں Mo. 93583 57370

۲۴	میسرس عامر کتاب سینٹر ۳۳۴۔ایچ گلی نمبر۔۶، باٹلہ ہاؤس جامعہ نگر نئی دہلی۔110025 Mo. 098110 29831
۲۵	میسرس قریشی نیوز ایجنسی جی۔بی۔ایچ۔مین روڈ، راؤ کیلا، اڑیسہ -760001 Mo. 94394 99458
۲۶	میسرس صالحہ بک ٹریڈرس اینڈ اسٹیشنر جامع مسجد، مومن پورا ناگ پور، مہاراشٹر۔-, 440018 Mo. 07122 721069
۲۷	میسرس راعین بک ڈپو ۳۴۷، کٹرہ، الہ آباد، (U.P). 211003 Mo. 99365 16895
۲۸	جناب بصر الدین سکریٹری غالب لائبریری، ۶، غالب نگر فیروز آباد۔(U.P).283203 Mo.94562 39242
۲۹	ڈاکٹر وجہ القمر صدیقی جے۔کے کالونی، لولی پور، حنیف نگر لولی پور سلطانپور(U.P). 228001 Mo.94515 58318
۳۰	جناب تنویر تنویر بک ڈپو، ۱۱۲، جی۔ٹی۔روڈ آسن سول، مغربی بنگال۔ 713301. Mo. 98321 14440
۳۱	میسرس کتاب دار پبلی کیشنز ۱۱۰۔۱۰۸، جلال منزل ٹمکر اسٹریٹ، ممبئی، 7400008
۳۲	خالد لائبریری نزد مسلم فنڈ ٹرسٹ، دیوبند، سہارنپور Mo.92863 64999
۳۳	میسرس ایم۔ایچ بک سیلر ہول سیلر اینڈ ریٹیلر، محلہ رحم گنج دربھنگہ۔846004 Mo. 094314 58429
۳۴	جناب ندیم اختر جن سیوا کیندر، پوسٹ۔گنج ڈنڈوارہ ضلع۔کاس گنج، (U.P) 207242
۳۵	میسرس خوشتر کتاب گھر پوسٹ، ہلور، سدھارتھ نگر- 272191 Mo. 94156 69624
۳۶	نور نبی بک سیلر اینڈ نیوز پیپر ایجنٹ سی۔کے۔۱۰۱/۴۲، دال منڈی وارانسی۔(U.P) 221001 Mo-94153 55954
۳۷	جناب شہاب حسین 'جرنلسٹ' محلہ ناظر پورہ، بہرائچ۔ 271801 Mo- 94523 11999
۳۸	جناب محمد شوکت علی بک اسٹال ۲۱/اے، ایچ۔ایم۔ایم اسکوائر نزد مسلم انسٹی ٹیوٹ، کولکاتا۔مغربی بنگال
۳۹	جناب خالد قیصر محلہ سریان،، پوسٹ محمدی۔ ضلع لکھیم پور (U.P).262804 Mobile .94155 62853
۴۰	میسرس جبلی بک سینٹر ۱۱۹/۱۰۵، جبلی کالج روڈ چمن گنج، کانپور(U.P).208001 Mo. 09336720718
۴۱	میسرس سحر بک ایجنسی وثیقہ عربک کالج، راٹھ حویلی، ضلع فیض آباد۔ 224001.(U.P), Mo.95653 83714
۴۲	جناب خبیب حسن کمرہ نمبر ۲۲۳، جامعہ سلفیہ، ریوری تالاب بی۔۱/۱۸، جی، وارانسی۔ 221010 Mo . 95576 3570014
۴۳	جناب ایس۔پرویز میسرس ہورائزن ڈسٹر بیوٹر ۱۴۔بی۔گوراچاند روڈ، کولکاتا۔700014 Mo. 9831311918
۴۴	جناب محفوظ الرحمن کنسٹرکشن ڈویژن۔۱، پی۔ڈبلیو۔ڈی، ہردوئی Mo . 9451916715
۴۵	جناب اظہار ندیم عرشیہ پبلیکیشن، اے۔۱۷۰ گراؤنڈ فلور، ۳۔سوریہ اپارٹمنٹ، دلشاد کالونی، نئی دہلی۔ Mo 9971775969
۴۶	میسرس۔سکندر نیوز ڈسٹر بیوٹر اینڈ سپلائر، لال چوک، شری نگر، جے اینڈ کے Mo. 9797797124
۴۷	میسرس کوثر ایجنسی ریاض خان، معرفت اکولہ پان بھنڈار پان مارکٹ، جنتا بازار، اکولہ۔ 444001 Mo. 098221 25888
۴۸	ماسٹر محمد سلیم شجاع ول پور، پوسٹ ڈنڈوارہ۔ضلع کاس گنج Mo. 9557996293
۴۹	جناب سالم رضوی معرفت عثمانیہ بک ڈپو ۱۲۵، ربیندرا سرائے، کولکاتا Mo. 09433050634
۵۰	جناب محبوب علی محلہ۔چکی ٹولہ، پوسٹ لہر پور، سیتا پور Mo. 9559347469
۵۱	جناب حاجی نثار احمد شعبہ اردو، حیدرآباد یونیورسٹی، سینٹرل یونیورسٹی، پروفیسر سی آر راؤ روڈ حیدرآباد۔500046 Mo. 09391062713
۵۲	جناب اشرف الحق انصاری اشرف نیوز ایجنسی، وارث پورا، کامپٹی، ناگپور Mo. 08956697056
۵۵	مکتبۂ جامعہ اردو بازار، جامع مسجد، نئی دہلی۔۶
۵۶	جناب شفیق الرحمن 1/170، گنگا وہار، KDA کالونی، جاج مئو، کانپور موبائل: 9415483499
۵۷	ابرار الحق شاطر گورکھپوری الٰہی باغ نزد چھوٹی مسجد، گورکھپور موبائل: 9695122448

نیا دور کی ایجنسی صرف دس شماروں کی ایڈوانس رقم ڈرافٹ کے ذریعہ بھیج کر حاصل کی جاسکتی ہے۔ایجنسیاں ۴۰ رفیصد کمیشن کی حقدار ہوں گی۔

آپ کے خطوط

ماہنامہ 'نیادور' کا تازہ شمارہ (فروری ۲۰۱۸ء) میں نے لکھنؤ سے ہزاروں میل دور انٹرنیٹ پر پڑھا۔ آپ مبارکباد کے مستحق ہیں کہ آپ نے 'نیادور' کے اس شمارے میں مقبول شاعر بشیر ندر پر گوشہ شائع کر کے انہیں خراج تحسین پیش کیا اور ان کی شخصیت، شاعری اور فکر وفن پر نہایت عمدہ اور معیاری مضامین شائع کئے جو یادگار رہیں گے۔

بشیر بدر ان شدید طور پر علیل ہیں اور نقل و حرکت کے لئے وہیل چیئر کا سہارا لیتے ہیں۔ وہ Dementia کے عارضے میں مبتلا ہیں جس کی وجہ سے ان کی یادداشت تقریباً جا چکی ہے۔ وہ اپنی عمر عزیز کی ۸۳/ بہاریں دیکھ چکے ہیں۔ ۱۵/فروری ۲۰۱۸ء کو بھوپال میں سادگی کے ساتھ ان کی ۸۳ویں سالگرہ منائی گئی۔ ان کی بیگم راحت بدر ان کی شریک رنج وراحت ہیں۔

بشیر بدر سے علی گڑھ کے دوران قیام کی میری بہت ساری یادیں وابستہ ہیں۔ یہ ۱۹۷۰ء کے آس پاس کی بات ہے جب وہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے طالب علم تھے اور اردو میں ایم اے کر رہے تھے۔ اسی زمانے میں میں اسی یونیورسٹی کے شعبۂ لسانیات میں پی ایچ ڈی کر رہا تھا۔ بشیر بدر اپنے ہم جماعتوں سے عمر میں کافی بڑے تھے کیونکہ انہوں نے علی گڑھ آنے اور ایم اے میں داخلہ لینے سے قبل پولیس کے محکمے میں ملازمت کی تھی اور اعلیٰ تعلیم کا خیال انہیں بعد میں آیا تھا۔ علی گڑھ آنے ہی وہ یونیورسٹی کی ادبی فضا پر چھا گئے۔ ان کی پرکشش اور مترنم آواز اور غزل سرائی کے منفرد انداز نے سب کے دلوں پر اپنا سکہ جما دیا تھا۔ اپنے کلام کی تازگی، ندرت اور جدت کی وجہ سے وہ بہت جلد لوگوں میں مقبول ہو گئے تھے۔ مشاعروں میں جس میں وہ اپنا کلام سناتے تھے تو مجمع پر چھا جاتے تھے اور سامعین ہمہ تن گوش ہو کر ان کا کلام سنتے تھے۔ مجھے علی گڑھ کے مشاعروں اور نشستوں میں بارہا ان کا کلام سننے کا موقع ملا ہے۔ علی گڑھ میں اس زمانے میں ان کے مقابلہ کا شاعر شہریار کے علاوہ کوئی دوسرا نہ تھا۔ ہر چند کہ جذبی، خلیل الرحمن اعظمی، وحید اختر اور وارث کرمانی وغیرہ بھی اس زمانے میں شاعری کر رہے تھے لیکن وہ لوگ ادب میں بھی اپنی جگہ بنا چکے تھے اور ان کے شمار سینئر شعراء میں ہوتا تھا۔ اس زمانے میں بشیر بدر نے اپنا مجموعۂ کلام 'اکائی' شائع کیا جس کا ایک نسخہ از راہ کرم انہوں نے مجھے بھی عنایت کیا تھا جو آج تک میری ذاتی لائبریری میں محفوظ ہے۔ علی گڑھ سے فارغ التحصیل ہونے کے بعد وہ میرٹھ چلے گئے پھر میں نے سنا کہ وہ بھوپال منتقل ہو گئے ہیں۔ شعر و ادب سے دلچسپی رکھنے والے علی گڑھ کے احباب آج بھی ان کے اشعار گنگناتے ہیں اور مترنم آواز آج بھی کانوں میں رس گھولتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ خدا کرے وہ جلد روبہ صحت ہو جائیں۔ آمین

'نیادور' کے اس شمارے میں ندا فاضلی پر بھی اچھا خاصا علمی مواد شاملکر کے آپ نے انہیں خراج عقیدت پیش کیا ہے۔ امید کرتا ہوں کہ مقبول شاعروں اور ادیبوں پر 'نیادور' میں اسی طرح کے گوشوں کا سلسلہ آئندہ بھی جاری رہے گا۔

پروفیسر مرزا خلیل احمد بیگ

Bronfield, CT (USA)

نیا دور نئے رنگ و روپ میں نظر آ رہا ہے۔ جونپور میں معروف افسانہ نگار و نقاد جناب ایس ایم عباس سے نیا دور مل جاتا ہے۔ موصوف نیا دور کے قدیم لکھنے والے ہیں اور اس کی ایجنسی بھی ان کے پاس ہے۔

فروری کا شمارہ بشیر بدر اور ندا فاضلی جیسے ہمارے بڑے اور قدآور شعراء پر مشاہیر کے مضامین و مقالات خوب ہیں۔ ویسے تو ان دونوں معاصر شعراء پر تازہ تحریریں اپنی ایک علیٰحدہ دستاویزی اور معنوی حیثیت رکھتی ہیں۔

ندا فاضلی پر ایک عمدہ اور طویل مقالہ دیدہ ور نقاد وارث علوی کا بھی ہے جو ان کی تنقیدی کتاب 'ناخن کا قرض' میں شامل ہے۔

نیادور کا یہ بھی نیا قدم ہے کہ آئندہ شماروں کی پیش بندی کر کے آنے والے شماروں کی جھلکیاں بھی دے دی جاتی ہیں۔

محمد عرفان جونپوری

محلہ میر مست، جونپور

ندا فاضلی اور بشیر بدر پر خصوصی مضامین

'نیادور' کے تازہ شمارے کی خصوصیت

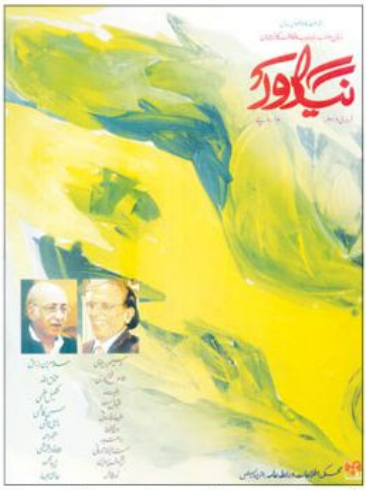

سہیل وحید بہت محنت کر رہے ہیں 'نیا دور' کو نیا روپ دے چکے ہیں پھر بھی مطمئن نہیں نظر آ رہے ہیں جس سے امید ہے کہ خوب سے خوب کی کوشش ابھی ختم نہیں ہوگی۔

فروری ۲۰۱۸ کا شمارہ گزشتہ شماروں سے زیادہ پُرکشش ہے۔ کاغذ، طباعت، مضامین بہتر ہیں۔ بشیر بدر اور ندا فاضلی پر انہوں نے کارآمد مضامین لکھوا لئے ہیں خوشی کی بات ہے کہ وہ بڑے نام نہیں تلاش کر رہے ہیں بڑا کام دیکھتے ہیں اسی لئے نئے لکھنے والوں کو زیادہ موقع دے رہے ہیں اور ان کی تخلیق کو بڑے سلیقے سے شائع کر کے لوگوں کو پڑھنے کیلئے کشش پیدا کر رہے ہیں تو نئے لکھنے والوں کی حوصلہ افزائی بھی کر رہے ہیں۔

فروری کے شمارے میں ندا فاضلی اور بشیر بدر پر اچھے مضامین میں خصوصیت سے ندا فاضلی پر مالتی جوشی کا مضمون جو نجیب انصاری کے ترجمہ کے ذریعے پیش کیا گیا ہے قابل مطالعہ ہے۔ ندا فاضلی پر بہت کچھ لکھا جا سکتا ہے مگر ان کی ذات اور شخصیت پر لکھنے کیلئے مالتی جوشی کا مضمون یقیناً بڑا مددگار ثابت ہوگا ایسے میں مزید مضامین کی ضرورت کو محسوس کیا جاتا ہے ان سے فنکار کی اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ اس کی سچائیاں نمایاں ہوتی ہیں تب اس کے فن کا بہتر طور سے موازنہ و مطالعہ کیا جا سکتا ہے۔

'نیادور' اسی طرح نکلتا رہے یا بندی سے نکلتا رہے تو بہت کچھ اچھا پڑھنے کو مل سکتا ہے۔

روزنامہ آگ، لکھنؤ (یکم مارچ ۲۰۱۸ء)

نیادور کا فروری کا شمارہ نئے رنگ و آہنگ کے ساتھ نظر نواز ہوا۔ یوں تو نیا دور کی ہمیشہ سے اپنی ایک الگ شناخت رہی ہے اور آغاز سے اب تک اس جریدے نے وقت سے ہم آہنگ ہونے کا ثبوت دیا ہے تاہم اس بار جو نئی تبدیلیاں دیکھنے میں آئیں وہ زیادہ لائقِ تحسین ہیں۔ آپ کی ادارت کے روزِ اول ہی سے نیادور نے اپنے سفر کی تاریخ میں ایک نیا موڑ لیا اور نئے مناظر خلق کرنے کے باوجود خوب سے خوب تر کی کوشش نے ابھی تک کسی منزل پر دم نہیں لیا ہے۔ یہ آپ کے تازہ دم و تازہ کار ہونے کے ساتھ ساتھ آپ کی خلاقانہ ذہنیت کا ثبوت ہے۔

جہاں ماضی کے شمارے اپنی تاریخی و ادبی حیثیت کے لحاظ سے کافی اہم ہیں وہیں تازہ شمارے اپنی ندرت اور تازہ کاری کے لیے ایک نئی تاریخ رقم کر رہے ہیں۔ ہم ایک ایسے عہد میں جی رہے ہیں جہاں ادبی دنیا ایک جنگل بن کر رہ گئی ہے اور ہر سمت خودرو قسم کے شاعر و ادیب پیدا ہو رہے ہیں۔ ایسے میں نہ صرف کانٹوں سے دامن بچا کر نکل جانا بلکہ اس جنگل کے خوشنما پھولوں سے اپنے دامن کو بھر لینا آپ کی مدبرانہ صلاحیتوں پر دلالت کرتا ہے۔

اردو اخبارات و رسائل کا موجودہ معیار و منہاج کسی سے ڈھکا چھپا نہیں ہے، ایسے میں نیادور کے معیار کو نہ صرف قایم رکھنا بلکہ اسے ادب کی نئی بلندیوں سے آشنا کرانا اور اسے ادبی رسائل کی دنیا میں ایک منارۂ نور کی حیثیت عطا کر دینا ایک مدیر کا معجزۂ فن ہی ہو سکتا ہے اور آپ اس کے لیے مبارک باد کے مستحق ہیں۔ تازہ شمارے کی ابھی ایک ہی قرأت ممکن ہو سکی ہے۔ پہلی نظر میں رسالہ کا صوری رنگ و آہنگ اچھا لگا۔ بشیر بدر اور ندا فاضلی پر شمارہ شائع کرنا اس لیے بھی اہم ہے کہ ندا فاضلی قدرے کم مگر بشیر بدر پورے طور پر مشاعروں کے مقبول ترین شاعروں میں تھے اور ادب کے خود ساختہ ٹھیکے داروں نے مشاعرہ پڑھنے والے شاعروں کو کبھی قابلِ التفات نہ جانا (یہ الگ بات ہے کہ ہمارے بعض مشاعرے کے شاعروں میں اتنی تخلیقی اپج تھی کہ ان کو نظر انداز کرنا ان کے بس میں نہ تھا) ایسے میں ایک پورا شمارہ ان کے لیے مختص کرنا بڑے دل گردے کا کام ہے۔

تازہ شمارے کے مشمولات بھی سرمۂ اہل، نظر بننے کی بھر پور صلاحیت رکھتے ہیں۔ شعری انتخاب کی داد دینے سے چشم پوشی کرنا انصاف کے تقاضوں سے مغائر ہے۔ محترمہ مالتی جوشی کا مضمون ندا صاحب کی زندگی سے متعلق حقائق کا ترجمان ہے۔ صفحہ تیس سے شروع ہونے والے مضمون پر صاحب مضمون کا نام نہ ہونے سے ذرا تذبذب کی کیفیت رہی پھر بھی 'جان جائیں گے جاننے والے'۔ وسیم بریلوی صاحب کا مضمون پڑھ کر لطف آ گیا، کیا کوثر و تسنیم سے دھلی ہوئی زبان ہے اور اس پر صداقت کی روشنی 'نور علیٰ نور'۔

سلام بن رزاق، پروفیسر عتیق اللہ اور شکیل اعظمی کے مضامین اپنی بھی پسند آئے۔ حسن کاظمی نے تفصیل سے لکھا ہے اور بہت اچھا لکھا ہے۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ وہ اتنی اچھی نثر بھی لکھتے ہیں۔ ڈاکٹر مظہر احمد، زیبا محمود اور عائشہ ضیاء کی تحریریں نسبتاً کمزور ہیں، زبان و بیان کی کمزوریاں بھی راہ پا گئی ہیں۔ اس طرف توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ مجموعی طور پر نیادور کی موجودہ رنگا رنگی سے دل و نظر کو مسرت ہوئی جس کیلئے آپ یقیناً شکریہ کے مستحق ہیں۔

ایاز احمد اعظمی

بالاسور، اڑیسہ

نیادور کے کئی شمارے پڑھنے کو ملے۔ یہ رسالہ پہلے بھی اچھا لگتا تھا مگر اب زیادہ اچھا لگنے لگا ہے۔ ظاہر ہے اس کا سہرہ نئے مدیر سہیل وحید کے سر بندھتا ہے۔ سہیل وحید چونکہ خود بھی ایک تخلیق کار ہیں اس لیے اس رسالے کی نگارشات کے انتخاب اور ترتیب و تزئین میں تخلیقی شان بھی دکھائی دینے لگی ہے۔ جس کی

Prof. Saghir Afraheim
Chairman
Department of Urdu
A.M.U., Aligarh-202002
E-mail: s.afraheim@yahoo.in

Gul-e-Afraheim, Street No. 4 A
Greater Azad Enclave
Dhorra, Aligarh-202002
Mob: 09358257696, 09410426855

Ref. No.
Date: 10. 03. 2018

Mr. Suhail Waheed
Editor,
'Naya Daur' (Monthly)
Lucknow

Sir,

I acknowledge with thanks the receipt of your latest *'Naya Daur'* issue, Vol. No. 72, Issue No. 11, of Feb. 2018. This issue is *'Special'* for its quality writes-up and collections.

First of all, I would like to congratulate you for publishing such a beautiful and voluminous Special issue ***"NAYA DAUR"***, comprising 96 pages. This special issue consist of a number of extraordinary articles and *Ghazals*. All the *'Ghazals'* in this issue are very exclusive and effectively impressed its readers. Each and every Ghazal & article has captivated its readers and Urdu lovers. Hence, a wisdom or aesthetic pleasure can be harvested with full benefit. This issue is very informative also, and the date of births (in February) of some famous Urdu poets and writers on the inner title cover make the issue much adorable. Further, its cost is just Rs. 10/- only in order to reach a large number of readers. I think it is a remarkable work for Urdu language and literature, which will be appreciated by scholars and Urdu readers.

I congratulate and good wishes for this great contribution for Urdu literature and deep gratitude for your guidance, cooperation and help in the Information & Public Relations Department, Lucknow.

Thanks & regards,

Yours sincerely,

Saghir

Prof. Saghir Afraheim
Chairman,
Dept. of Urdu &
Editor, Tahzibul Akhlaq
A.M.U., Aligarh-202002 (U.P.)

وجہ سے رسالے کے حسن میں اضافہ تو ہوا ہی ہے اس کی معنویت بھی بڑھ گئی ہے۔ مدیر کی دلچسپی اور تگ و دو کے رنگ و آہنگ بھی نظر آتے ہیں۔ اس وقت میرے سامنے نومبر ۲۰۱۷ء کا شمارہ ہے۔ اس شمارے کی حیثیت کسی مخصوص شمارے کی ہوگئی ہے کہ اس میں نوبل انعام یافتہ کازوَ واشی گورو کا بھرپور تعارف بھی پیش کیا گیا ہے۔ یہ تعارف نہ صرف یہ کہ ایک بڑے ناول نگار کے کارناموں سے متعارف کراتا ہے بلکہ دوسرے لکھنے والوں کے اندر تحریک بھی پیدا کرتا ہے۔

اس شمارے میں ایک اور اہم مضمون بھی شامل ہے جسے مشہور شاعر منور رانا نے قلم بند کیا ہے۔ دراصل یہ اتر پردیش کے گورنر جناب رام نائک کا خاکہ ہے جس میں رام نائک کو ایک سیاست داں کے بجائے ایک ادیب کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔ جناب رام نائک صاحب کا یہ چہرہ ان کے سیاسی نظریات سے اختلافات رکھنے والوں کو بھی پسند آئے گا کہ یہ اس شخص کا چہرہ ہے جو انسانوں کے دکھ سے دُکھی ہوتا ہے اور غموں کا مداوا بھی تلاش کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ منور رانا کی نثر نے اس خاکے کو اور بھی خوبصورت اور جاندار بنا دیا ہے۔

ف۔س اعجاز کا مضمون کھاسی زبان اور اس کی مشہور لوک کتھائیں کافی معلوماتی ہے اور ہندوستان کے ایک علاقے کی تہذیب و ثقافت سے متعارف کراتا ہے۔ یشپال کی ہندی کہانی پردہ ایک خوبصورت کہانی ہے۔ عزیز نبیل، راشد جمال فاروقی اور ڈاکٹر عزیز خیرآبادی کی غزلیں اچھی لگیں۔ ڈاکٹر جمیل دوشی کی کتاب رامپور میں اردو مثنوی پر نجیب انصاری کا تبصرہ بہت عمدہ ہے۔

عطیہ خانم

دہلی یونیورسٹی، دہلی

سب سے پہلے میں آپ کو مبارک باد پیش کرتا ہوں کہ ماہنامہ نیا دور، لکھنؤ پھر سے پٹنہ کے بک اسٹال پر نظر آنے لگا ہے۔ اِس کے معیار و وقار کو دیکھ کر جی خوش ہو گیا۔ آپ کی آمد سے یہ ممکن ہوا ہے۔ یعنی پاسبان مل گیا۔ خدا کرے آپ بخیر ہوں اور زبان و ادب اردو کی نمایاں خدمات انجام دیتے رہیں۔ یہی میری دعا ہے۔

ڈاکٹر شاہد جمیل

پٹنہ (بہار)

ابھی ابھی آپ کا ترسیل کردہ فروری ۲۰۱۸ء کا تازہ شمارہ موصول ہوا۔ رسالہ کے گیٹ اپ، ترتیب و تزئین سے یقین کرنا مشکل ہو گیا کہ یہ نیا دور کا ہی شمارہ ہے۔ اتنا جامع، اتنا خوبصورت، اتنا جاذب نظر رسالہ کی اشاعت پر دلی مبارکباد قبول فرمائیں۔

احمد مشکور

میوروہار، دہلی

نئے انداز، نئی شان کے ساتھ 'نیا دور' کا نیا پرچہ ندا فاضلی، بشیر بدر کے نمبر کی شکل میں نظر نواز ہوا۔ اتنا خوبصورت، جاذب نظر کہ نظر پھسل رہی ہے۔ ایسے پرچہ پیش کرنے کے بعد آپ کو ایک نہیں سو سو مبارکبادیاں پیش کرنے کو جی چاہتا ہے۔ کچھ مضمون نہایت محنت سے لکھے گئے ہیں تو کچھ یادداشتوں کو دہرایا گیا ہے۔ شاعر فتح پوری، مست حفیظ رحمانی، حسن کاظمی اور زیبا محمود وغیرہ نے کامیابی سے کوشش کی ہے۔ نیا دور کے عملے کی کوششوں کو مبارکباد۔

بختیار قیسی

قلعہ روڈ، محلہ نگپور

'نیا دور' کا شمارہ جولائی، جون، ستمبر اور دسمبر ۲۰۱۷ء کا ایک ساتھ دستیاب ہوا۔ تمام شمارے اچھے ہیں۔ دسمبر کا شمارہ جو ۹۲ صفحات پر مشتمل تھا اور سرورق میں اردو زبان کے الفاظ کو ترتیب سے سجایا گیا تھا، اس میں نعت بہت اچھی ہیں۔ خاص کر اعلیٰ حضرت احمد رضا خاں بریلوی کی 'مصطفیٰ جان رحمت پہ لاکھوں سلام' یہ مکمل سلام پہلی بار پڑھنے کو ملا۔ اردو کے متعلق اردو کے رسم خط کی چند بنیادی باتیں نیز اس موضوع سے متعلق تمام مضامین اچھے لگے۔ اردو کی تدریس میں اجتہاد کی ضرورت، اردو کی ابتدا اور ارتقاء کا مختصر جائزہ اس کے علاوہ تمام مشمولات معیاری ہیں۔ رسالے کو آپ نے بہت جاذب نظر بنا دیا ہے۔

ڈاکٹر شرف الدین خان

امانا کا، رائے پور

جب سے آپ نے نیا دور کے آنگن میں قدم رکھا، میں آپ کا خیر مقدم ہی نہیں کر سکا ہوں۔ چونکہ نیا دور سے ایک خاصہ پرانا تعلق رہا ہے۔ جہاں تک یاد آتا ہے کہ سب سے پہلا شمارہ جعفر علی خاں اثرؔ پر میں نے خریدا تھا۔ وہ شاید اب بھی نیا دور کی جلدوں میں کہیں محفوظ ہو۔ یہ نمبر ۱۹۶۲ء کے آس پاس کا ہے۔ آپ نے نیا دور کی روپ ریکھا بالکل ہی بدل دی۔ نہ جانے کتنے جزیرے تلاش کئے اور انہیں آباد کر رکھا ہے۔

ایس ایم عباس

ترتلیا، جونپور

فروری کا شمارہ موصول ہوا۔ دیدہ زیب سرورق، بہترین کاغذ، عمدہ طباعت اور جاذب تزئین کاری اور لائق مطالعہ مواد الغرض خوبیوں سے پُر، بشیر بدر اور ندا فاضلی پر مبنی یہ شمارہ کافی معلوماتی ہے۔ تقریباً سارے ہی مضامین عمدہ ہیں اور پڑھنے سے تعلق رکھتے ہیں۔ بشیر بدر کی غزلیں اور ندا فاضلی کے کلام بھی کافی مناسب اور عمدہ قسم کے منتخب کئے گئے ہیں۔

سیف زیدی

دیوگاؤں، اعظم گڑھ

خواتین مستحکم کاری تقریب کے سلسلہ میں وارانسی آمد پر

وزیراعظم جناب نریندر مودی کا استقبال کرتے ہوئے اتر پردیش کے گورنر جناب رام نائیک (۱۲/مارچ ۲۰۱۸ء)

اتر پردیش کے گورنر جناب رام نائیک اور وزیراعلیٰ یوگی آدتیہ ناتھ جی

راج بھون، لکھنؤ میں سبزیوں اور پھولوں کی نمائش کا افتتاح کرتے ہوئے (۲۱/فروری ۲۰۱۸ء)

لکھنؤ میں بین الاقوامی یوم خواتین کے موقع پر اتر پردیش کے وزیراعلیٰ جناب یوگی آدتیہ ناتھ جی اور مرکزی وزیر محترمہ اوما بھارتی

'سوچھ بھارت مشن' میں نمایاں خدمات انجام دینے والی خاتون کو اعزاز سے نوازتے ہوئے (۸/مارچ ۲۰۱۸ء)

उर्दू मासिक
नया दौर
पोस्ट बॉक्स सं0 146,
लखनऊ – 226 001

صدر جمہوریہ ہند جناب رام ناتھ کووند'یوپی انوسٹرس سمٹ-۲۰۱۸ء' کا افتتاح کرتے ہوئے
ساتھ میں ہیں اتر پردیش کے گورنر جناب رام نائیک اور وزیر اعلیٰ یوگی آدتیہ ناتھ جی و دیگر معززین (۲۱ر فروری ۲۰۱۸ء)

'یوپی انوسٹرس سمٹ-۲۰۱۸ء' کے موقع پر وزیر اعظم جناب نریندر مودی، مرکزی وزیر جناب راج ناتھ سنگھ
اتر پردیش کے گورنر جناب رام نائیک اور وزیر اعلیٰ یوگی آدتیہ ناتھ جی و دیگر معززین (۲۲ر فروری ۲۰۱۸ء)

वर्ष : 72 अंक 11
मार्च 2018
मूल्य : 10 रु./–
वार्षिक मूल्य : 110 रु./–

पंजीयन संख्या : 4552/51
एल0 डब्लू/एन0 पी0/101/2006–08
ISSN 0548-0663

प्रकाशक व मुद्रक, अनुज कुमार झा, निदेशक द्वारा सूचना एवं जनसम्पर्क विभाग, उ.प्र. के लिए प्रकाश पैकेजर्स, 257 गोलागंज, लखनऊ से
मुद्रित एवं प्रकाशन प्रभाग, सूचना एवं जनसम्पर्क विभाग, उ.प्र., सूचना भवन, पार्क रोड, लखनऊ–226001 से प्रकाशित–सम्पादक, **सुहेल वहीद**

نیا دور کے شمارے اب A.H. Wheeler لکھنؤ کے سبھی بک اسٹالوں پر بھی دستیاب ہیں

For Latest Issues of Naya Daur visit at www.information.up.nic.in